

TIGHT BINGING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222590

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱۳۵

بزمِ اکبر

یعنی
اکبر الہ آبادی کے سوانح حیات
اور
کلام پر تنقید

تالیف

مولوی قمر الدین احمد صاحب بدایونی
بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ)

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

۱۹۴۰ء

خانصاحب عبداللطیف نے بطبعی پریس لمیٹڈ دہلی میں چھاپا
اور
مینجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کیا

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحات
۱	تمہید	۵
۲	باب اول :- سوانح حیات	۱۵
	(۱) حسب نسب	۱۵
	(۲) تعلیم و تربیت	۱۶
	(۳) عہد جوانی	۲۱
	(۴) شادیاں	۲۱
	(ب) کوچہ سحر و شاں	۲۸
	(ج) مشق سخن اور شاعری کے جملے	۳۲
	(د) تلاش معاش و ترقی	۳۸
۳	باب دوم :- مؤلف کتاب ہذا سے اکبر کے مراسم اور خطوط	۴۷
۴	باب سوم :- مؤلف کی ڈائری کے ادراک (شمل بر لطائف و ظرائف اشعار، حالات خاص، پنہاں مطالب، کلام خانگی و دیگر حالات)	۷۰
۵	باب چہارم :- مرض الموت اور انتقال	۱۸۲
۶	باب پنجم :- کلام پر تنقید	۱۸۹

تمہید

کسی کے حالاتِ زندگی پیش کرتے وقت ایک مؤلف کو متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی مشکل جو درپیش ہوتی ہے وہ صداقتِ بیان کی ہے۔ یہ دشواری اس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس کی زندگی کے حالات تحریر کیے جا رہے ہیں اس سے مصنف کے تعلقات بھی ہوں، مصلحت اور محبت قدم قدم پر روکتی ہے کہ خصلت کے کمزور پہلو ترک کر دیے جائیں۔ اگر دل کے تقاضے پر توجہ کی جائے تو سیرت نامکمل رہ جاتی ہے اور انسان کی وہ اصل تصویر دنیا کے سامنے آتی ہی نہیں جس کو انصافاً پیش ہونا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں یہ ایک فنی بے ایمانی ہے کہ رنجیت سنگھ کو کسی تصویر میں آنکھ دبا کر بندوق کا نشانہ لگاتے ہوئے ایسا پیش کیا جائے کہ دنیا اس کو یک چشم نہ سمجھ سکے۔ کرامویل ایک مرتبہ تصویر کھینچوانے بیٹھا۔ بائیں رخسار پر ملوار کا ایک بد نما نشان تھا۔ مصوّر نے اس کو بجا دینے کے لیے کمرے کا تخت بدلا، کرامویل اس کے ارادے کو تاثر گیا، کہنے لگا ”ہر بانی فرما کر آپ میرے چہرے کی تصویر کھینچے نہ کہ اپنے

خیال کی۔ یہ داغ میرے چہرے کا ایک جز ہے، یاد رکھو یہ تصویریں
 نہ آیا تو ناکمل فوٹو کی اجرت تم کو کچھ نہ ملے گی۔ میں نے الہ آباد
 کے دوران قیام میں اکبر اودان کے اجاب و اقربا سے جو کچھ سنا
 اس کے متعلق ایک زمانے تک چہ کنم میں رہا کہ اکبر حسین کی زندگی
 کے تمام پہلو منظر عام پر لاؤں یا نہیں۔ اگر اخلاق کے ضعیف پہلو محو
 کردوں تو بقول مرحوم یہی کہنا پڑتا ہے کہ۔ ع
 تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہیں
 گفتنی درج گزٹ باقی جو ہر ناگفتنی

اود اگر مرحوم کو ان کمزوریوں کے ساتھ پیش کردوں جو بہ تقاضائے
 بشری ان میں تھیں تو اپنے احساسات محبت مجروح ہوتے ہیں۔ غرض کہ
 اس مجھسن نے بہت ستایا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، اس دوران میں مرزا
 فرحت اللہ بیگ صاحب کی بیان کردہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کی سچی
 کہانی کانوں میں پڑ چکی تھی۔ غرض کہ اس کشمکش خیال کا آخری نتیجہ یہ نکلا
 کہ جذبہ حقائق نگاری نے دوسرے احساسات کو دبایا اور میں اب
 اکبر کو بالکل دیسا ہی پیش کر رہا ہوں جیسا میں نے ان کو پلا۔ اس پر
 اگر کسی صاحب کو رنج ہو تو وہ مرحوم کے اس اظہار صداقت پر نظر
 کرنے کے بعد مجھے معاف فرمادیں۔

نہ سہی حُسنِ عمل خوبی گفتار سہی

ہی تو اکبر میں بھی ایک بات گنہگار سہی

دیگر

خوب ایک ناصح مشفق نے یہ ارشاد کیا بزم میں اس نے تعلق جو کل اکبر کی منسی

فکر سے ذکر سے عبرت سے سمجھ کا نہیں واہ وا کے لئے لفظوں کی دکان تیرے مچنی
 طبع میں تیری وہی خامی حرص دنیا آتش خوف خدا سے نہ جلی ہی نہ بجھنی
 خود پرستی ہی بہت خلق کی خدمت کم ہی دل وہی کم ہی تو ہی دل شکنی چار کنی
 تکیہ بر جائے بزرگاں نہ تو ان زد گزراں مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ فتنی
 یہ تو پورے حالات پیش کرنے کی معذرت ہوئی، اب ان حالات کی
 ضرورت اور اکبر کی شاعری کی اہمیت کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے
 کارلائل کہتا ہے ”جو لوگ اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کے کارنامے
 فخر و ناز کے ساتھ نہیں دیکھتے انھوں نے گویا یہ طی کر لیا ہے کہ وہ
 خود عظیم المرتبت کبھی نہ ہوں گے“ اکبر نے خود بھی یہ صورت چیتاں
 ہی رونا روایا ہی فرماتے ہیں ۛ

نامور ہم میں پہلے ہوتے تھے جو دکھاتے تھے دستِ طبع کا زور
 اب الف جھک کے اُن کا داؤد ہوا اور زمانے نے کہہ دیا نو مور
 صائب نے دنیا کی ناقدری کا شکوہ کیا ہے اور کہتا ہے ۛ
 نہ باشد شعر من مشہور تا جاں در بدن باشد
 کہ بعد از مرگ آہو نافہ بیروں می دہد بؤرا

اگر یہ سچ ہے تو زندگی بھر کے کارنامے جانے دیجیے، اکبر کے قبر میں
 اُترنے کے بعد سے اہل ملک نے ایسے جوہر قابل کی قدر دانی
 کا کیا ثبوت دیا جو صوفیوں میں نمایاں صوفی تھا اور واعظوں میں
 خوش گفتار واعظ، رندوں میں کھلا ہوا رند تھا اور زاہدوں میں گوشہ
 نشین زاہد، قرآن خوانوں میں خوش گلو قرآن خواں تھا اور شاعروں
 میں بلند پایہ شاعر، رئیسوں میں اونچے درجے کا رئیس تھا اور مفلسوں

میں شکستہ حال نادار، ادیبوں میں چار زبانیں جاننے والا عمدہ ادیب تھا اور ہندسہ دانوں میں اعلیٰ مہندس، حکومت دوست لوگوں میں ممتاز حکومت دوست تھا اور سیاسی زندگی میں دو آتشہ کانگریس، اجلاس پر سیکڑوں کا حاکم بالا تھا اور مسجد میں ڈفالی کے برابر کھڑا ہونے والا۔ گھر میں دو مختلف معاشرت بیسیوں کا شوہر تھا اور بالا خانے والیوں کے سامان نمائش کا ایک تابندہ گوہر، عیادت خانے میں جن مرتضیٰ انگلیوں سے تسبیح کے دانے پھرانے والا تھا انہیں سے جلسہ سرود میں بہترین ستار بجانے والا غرض کہ ایک ہزل گو کے بقول کسی شعبے میں دیکھے اس نے اپنی قوت کا نمایاں مظاہرہ کیا ہے۔

نہ جلیلی طبیعت جب پھاندنے پہ آئی
پر دا نہیں بلا سے خندق ہو یا ہو کھائی
طبیعت کی متضاد کیفیات کو بدرجہ اتم بنا دینا معمولی قوت والوں کا کام نہیں ہے۔ خود کہتے ہیں

مگر بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی ناراض نہ ہو
کلیات اکبر میں قدیم و پامال مباحث حق و عقیق، فلسفہ و عرفان اور فطرت نگاری کے علاوہ بے شمار مسائل ایسے ہیں جو دوسرے شعرا کے دوا دین میں یا تو بالکل مفقود ہیں یا نہایت ہی تشنہ۔ اکبر نے ضروری مسائل پر شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے مثلاً ملکی و مشرقی شعار کی حفاظت، مغربی تمدن سے نفرت، رعایا اور

راعی کے تعلقات اور ہردو کے استقام، سرید سے اختلاف، تنگ خیال مولویوں کی پردہ دری، اخلاق و تعلیم کی اصلاح، اُردو ہندی کا موازنہ، ہندو مسلم اتحاد اور اس کی مشکلات، فحش اور خلاف منات کلام وغیرہ اور یہ ایسے مباحث ہیں جن کے بارے میں ضروریات حاضرہ کے مد نظر موافق یا مخالف عنوان پر قلم اٹھانا بہت ضروری ہے۔

میں نے اس خرمن کے یہ چند دانے پیش کیے ہیں، ان کو بڑھا اور پروان چڑھا، صاحبانِ بہت و ذوق کا کام ہے۔ ان پر نہ صرف مضامین بلکہ بیسٹ مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔ تنکپیر کے کلام پر اہل مغرب نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور شواہد پیش کر کے نئے نئے دعوے کیے ہیں۔ ایک مصنف دعویٰ کرتا ہے کہ تنکپیر باہی تھا اور اُس کا آبائی پیشہ سیہ گری تھا۔ دوسرے کا ادعا ہے کہ وہ کاشتکار تھا، تیسرے کا اعلان ہے کہ وہ ملاح تھا غرض کہ کوئی اُسے اداکار ثابت کرتا ہے کوئی ادیب کوئی اُس کے ڈاکٹر ہونے پر استدلال لاتا ہے تو کوئی اُس کے انجینئر یا گورکن ہونے پر۔ نتیجہ سب کا یہی نکلتا ہے کہ اُس نے جن مسئلہ پر جو حکیمانہ بات کہ دی ہے وہ اٹل ہے۔ لوگ اس یقین پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تنکپیر اسی خاص ماحول میں پلا بڑھا تھا ورنہ مخصوص فنون و مباحث کے اتنے باریک نکاتوں پر اُن کی نظر کیسے پہنچتی۔ تنکپیر کی طرح ہمارے پریاک کے ظریف فلسفی کی نگاہ بھی حقائق کی کچھ کم گہرائیوں تک نہیں پہنچتی۔

اس نے جو بات کہ دی ہے وہ بچہ کی لکیر ہو کر رہ گئی ہے ضرورت

اس کی ہر کہ اہل نظر کاوش و تحقیق سے کام لیں اور بے توجہی کی دلدل میں گرے ہوئے اس گوہر اکبر کو نکال جوہریوں کے سامنے پیش کریں۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کنا تب نگیں عجا

اکبر کی بد نصیبی ہو کہ وہ ہندستان میں پیدا ہوا در نہ ایسے کثیر التعداد جوہروں کا انسان اگر یورپ یا امریکہ میں جنم لیتا تو وہاں کے قدر شناس لوگ اس کو نہ صرف زندگی میں آنکھوں پر بٹھاتے بلکہ بعد مرگ اس کی خدمات کی مناسب تقبیر کر کے تمام دنیا سے اس کی عظمت کا لوہا منواتے۔ حیدر آباد کے ایک مخصوص علمی ذوق کے حامل سویٹین مولوی سراج الحق صاحب ڈپٹی کلکٹر نے ایک دن بہت افسوس کا اظہار کر کے فرمایا کہ اکبر کی ایک کھلی ہوئی بد نصیبی یہ ہو کہ اُن کے فرزند مولوی سید عشرت حسین صاحب نے سولہ سترہ سال سے اب تک چوتھا حصہ شائع کرنے کی فکر ہی نہ کی اور جو تیسرا حصہ شائع ہوا ہو وہ اس قدر مہر از اغلاط دبے ترتیب ہو کہ اُسے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہو۔ اشتہار و اعلاں نے اقبال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور اکبر جیسا کوہ و قار زمین میں دھنسا چلا جا رہا ہو۔ میں نے کہا کہ اس کا مولوی سید عشرت حسین صاحب کو خود افسوس ہو۔ اُنھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا ”میں خوش ہوا کہ حیات اکبر آپ لکھ رہے ہیں، میں خود کچھ حالات لکھ چکا ہوں اس لیے کہ مجھ سے زیادہ مشکل سے کسی کی واقفیت ہوگی۔ افسوس ہو کہ حصہ سوم میں کتابت کی بہت غلطیاں ہیں، مجھے سرکاری کاموں سے فرصت نہ تھی صحت کا کام ایک منشی کے سپرد تھا اب میں

نے پنشن لے لی ہو اور اپنے مکان میں مقیم ہوں۔ آئندہ کے لیے کوشش کروں گا کہ غلطیوں کی تعداد بہت کم ہو۔“

اکبر کا انتقال ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ہوا۔ گلیات کا تیسرا حصہ اگست

۱۹۷۲ء میں چھپ کر آچکا تھا۔ ایسی صورت میں اب مرحوم کا جتنا کلام باقی ہو وہ وہی ہو جس کو انھوں نے کچھ مصالح کے مد نظر اپنی زندگی میں چھاپنا مناسب نہ سمجھا، اس میں کے کچھ اشعار جو مجھے اس تاکید کے ساتھ سنائے تھے کہ ان کی زندگی میں شائع نہ کروں اس وقت پبلک کے سامنے آرہے ہیں کچھ بہت گرم اور شخصی طور پر کھلے ہوئے دل آزار قسم کے اشعار میں نے بھی شائع کرانے سے احتراز کیا ہے، باقی سب کلام مولوی سید عشرت حسین صاحب کے پاس محفوظ ہے، خدا جانے اس حصے کے شائع ہونے کی نوبت کب آئے گی میں مولوی سید عشرت حسین صاحب کو توجہ دلا رہا ہوں کہ اسے جلد چھاپ دیں کیوں کہ میری اس تالیف کے بعد پبلک کی تشنگی بہت بڑھ جائے گی۔ پندرہ بیس سال کا زمانہ بہت طویل گزر چکا ہے۔ حکومتیں، جماعتیں اور افراد پہلے کے مقابلے میں بہت کشادہ دل اور مائل بہ رواداری ہو چکے ہیں جس بات کو بیس سال قبل خانگی صحبت میں بھی منہ سے نکالنا قابل زبان بندی سمجھا جاتا تھا اب وہی بات علانیہ برسرِ ممبر کی جا رہی ہے۔ میرے ایک حیدر آبادی دوست گمشدی نراین پرشاد صاحب بی۔ اے، ایل ایل۔ بی نے سچ کہا کہ اب اکبر کے اشعار جذبات سے نہیں عقل و عدل سے جانچنے کا زمانہ ہے۔ اکبر کے چٹکی لینے پر لوگوں کو منہ نہ بنانا چاہیے۔ دل سے داد اس کی دینی چاہیے کہ اس نے کن حالات میں کیسے کیسے نادور اسالیب بیان

سے کام لیا ہی حصہ سوم اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اس سے قبل کے میرے نوٹ کروہ اشعار بیشتر غیر مطبوعہ تھے مگر چوں کہ بزم اکبر شائع کرنے کا موقع حصہ سوم کے نکلنے کے کوئی پندرہ سولہ سال بعد اب آیا ہی، مجھے بڑی زحمت اس میں ہوئی کہ ایک ایک شعر کو کلیات اکبر میں بالخصوص حصہ سوم میں تلاش کرنا پڑا۔ چونکہ حصہ سوم ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے نہایت ناقص چھپا ہی، ایک ایک شعر کے واسطے کئی کئی گھنٹے صرف کرنے پڑے۔ اس درد سہری کے باوجود بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن یہ کہ کچھ اشعار جن کو میں نے غیر مطبوعہ یا مطبوعہ ظاہر کیا ہی وہ مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نکل آئیں یا کچھ اور مغالطہ ہو گیا ہو تو صاحبان نگاہ اس کو میری سہو نظری پر معمول فرمائیں۔ اکبر کی شاعری کے محاسن گنانا اور ان کی خدمات کی تفصیل بتانا ایک کہی ہوئی بات کا دہرانا ہو گا۔ میں یہ کام مرحوم کی زندگی میں کئی برس تک اپنے مضامین کے ذریعے رسالہ "نقیب" بدایوں میں انجام دیتا رہا ہوں۔ اس وقت مختصراً اتنا عرض کرتا ہوں کہ اکبر کی شاعری محض عاشقانہ خروش کا اظہار یا تفسن طبع کا سامان نہیں ہی وہ ایک مرثیہ ہی قوم کی حالت کا، وہ ایک ڈراما ہی معارف اور حقائق کی پردہ کشائی کا، وہ ایک مبسوط تاریخ ہی عہد حاضر کی۔ میرا یقین ہی کہ اگر ملک پر کوئی ناشدنی آفت آجائے اور سیر و تواریح کا سارا سرمایہ دریا برد ہو جائے تو ارباب حل و عقد محض کلیات اکبر کو دیکھ کر زمانہ موجودہ کی ایک تاریخ مرتب کر سکتے ہیں اور آئندہ نسلوں کو بتا سکتے ہیں کہ اس عہد میں ہندستان کے مذہبی، تمدنی اور سیاسی حالات کیا تھے، حاکم و محکوم کے تعلقات کیسے تھے اور

یہ بد نصیب ملک ان دنوں کن مراحل حیات سے گزر رہا تھا۔ خواہ تشریف
یا نظم آپ اکبر کے کلام میں ایک انوکھا طرز ادا پائیں گے۔ سلاطین میں
اودھ پنج میں ایک کسان کی دعا شائع کرائی ہو اس کا اسلوب بیان
ملاحظہ فرمائیے۔ کسان اپنا درد دل خدا سے بھی کہتا ہو تو اس طرح
کہ صاحب کی شکایت نہ پیدا ہو۔ کسان کی زبان سے فرماتے ہیں ”ای
میرے اچھے خدا میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ تیرا کوئی سا جی نہیں تو لاٹ
صاحب سے بھی بڑا ہی، میں یہ جانتا ہوں کہ حاکم بندوبست نے بغیر تیری
مرضی کے مجھ پر جمع نہیں بڑھائی ہو، ای اللہ تو ہر جگہ ہو مگر اس موضع
میں شاید تو نے گزر نہیں کیا اور اگر گزر کیا تو میری اجڑی حالت کو دیکھ کر
مجھ کو اپنا بندہ نہ سمجھا اور اگر بندہ سمجھا تو گنہگار پایا اسی وجہ سے مجھ پر
جمع بڑھوا دی۔ ای اللہ میرا گناہ معاف کر، وہ گناہ کچھ بڑا بھی نہیں ہو
میں نے نیل والے صاحب کی ایک بھینس چرائی تھی مگر اس کے لیے
دو ہینے کی سزا بھی بھگت لی۔ اس نے میرے کھیت کا نقصان کیا تھا
میں نے اس کو باندھ رکھا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی گناہ نہیں کیا نہ
کسی کی زمین دبائی نہ مال چھین لیا۔ ای خدا اب مجھ پر فضل کر اور
میری اس دعا کو بدلی کے لفافے میں لپیٹ کر تیز رو بجلی کے ہاتھ صاحب
لوگوں کے پاس بھیج دے اور حکم دے دے کہ ہنگی بھر غریب کسانوں
پر مال گزاری کے واسطے ذرا سختی نہ کریں“ اسی طرح سے جو بات نظم
میں کہی ہو بڑی حکمت اور مصلحت کے ساتھ کہی ہو اس کو تشبیہ،
استعارہ، طنز یا ظرافت کے ایسے نادر غلاف میں لپیٹا ہو کہ جس میں سے
گزر کر ہر کس و فکس کی نظر بطون معافی تک نہ پہنچ سکے۔

انگلستان کے وزیر مسٹر بالفور کہتے ہیں ”اگر قدیم شاہراہ آج بھی
 زندہ ہوتے تو ہر ایک کو اُن تک اور اُن کے حقیقی خیالات تک رسائی
 کہاں نصیب ہوتی۔ اُن کی ذمہ داریاں اور اُن کی مصروفیتیں اُن کو
 ہر ایک سے ہم کلام ہونے سے باز رکھتیں لیکن کتاب کے توسط سے
 ہم اُن سے ہر وقت مل سکتے ہیں اور ان کے حالات و خیالات سے
 آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جب تک اچھی کتاب میسر ہو دُنیا بے لطف نہیں
 ہو سکتی یہ اپنی اس تالیف بزمِ اکبر میں میں نے سیکڑوں مطبوعہ و
 غیر مطبوعہ اشعار پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کون کون سے اشعار مرحوم
 نے کن کن حالات و خیالات کے تحت کہے ہیں اور ظاہری باتوں کے علاوہ
 کیا کیا پنہاں اور گہرے مطالب کس کس طرح ادا کیے ہیں جو لوگ ذرا عمیق
 نظر سے کام لیں گے وہ نہ صرف مسرور بلکہ مسحور ہو جائیں گے۔“

ہاں اہل درد ہی کوئی نقادِ سوزِ دل
 لایا ہوں دل کے داغِ نایاں کیے ہوئے

قمر الدین احمد

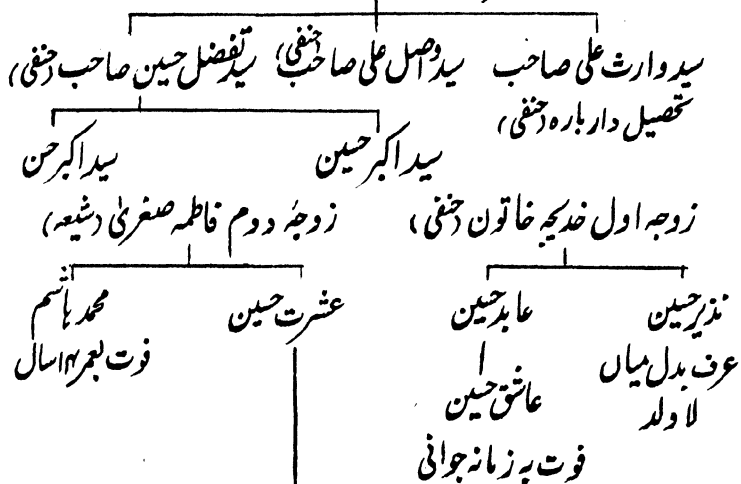
بدایونی

باب اول

سوانح حیات

حسب و نسب ضلع الہ آباد میں بارہ ایک مشہور قصبہ ہے۔ سید حسین علی اور سید عبداللہ جو تاریخ میں بادشاہ گروہ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اسی بستی کی خاک نے پیدا کیے تھے۔ خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی کا سلسلہ نسب اسی سرزمین کے خاندان سادات سے ملتا ہے۔ اس مولود مسعود نے جب ۱۸۳۷ء میں دنیا میں آکر آنکھیں کھولیں تو خود کو بارہ جیسے مردم خیز خطہ کی آغوش میں پایا۔ اکبر حسین کے دادا سید فضل محمد ناظر امامیہ مذہب رکھتے تھے۔ سید فضل محمد کے تین بیٹے ہوئے۔ سید وارث علی، سید دہل علی اور سید تفضل حسین۔ سید تفضل حسین ایک صوفی فن درویش تھے، اُن کا انتقال ۱۳۳۷ھ میں ہوا، ذات رب ماوہ تاریخ وصال ۱۳۳۷ھ قرار پایا۔

چو شد دہل ذات رب ذات اد
بجو سال تاریخ از ذات رب



سید محمد عقیل حسین سید محمد مسلم سید مظفر حسن سید محمد سلیمان
سید فضل حسین کے دو لڑکے ہوئے۔ سید اکبر حسین و سید اکبر حسن
اکبر حسن نے اچھی ترقی کی پہلے منصف ہوئے اس کے بعد اودھر کے
محکمہ جبریشن میں بشاہرہ چار سو روپیہ ماہوار انکسٹر اول رہے لیکن
عین شباب میں انتقال کر گئے۔ اکبر حسین کے ماں باپ تایا سب
حنفی مذہب رکھتے تھے۔

تعلیم و تربیت | سید وارث علی بارہ میں تحصیل دار رہے مگر انھوں نے اپنے بھتیجوں اکبر حسن و اکبر حسین کی تعلیم کی نگرانی خود سے متعلق کر لی تھی۔ سید نقض حسین بھی بجائی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ تایا کو کیا معلوم تھا کہ خرد سال اکبر آئندہ ملکیت سخن کی جاگیر پر کرے گا اور عالم گیر شہرت کا مالک ہوگا۔ گا ہے ماہے ذہانت آنکھوں آنکھوں میں کہ جاتی تھی سہ

شہید از قامت آں طفل واقف نیستی شاید

کہ ایں بالا بلا خواہد شدن بالیدہ بالیدہ

سید تفصل حسین صاحب اردو فارسی اور حساب اچھا جانتے تھے، کچھ طلبہ مکان پر جمع ہو جاتے تھے اُن کو اور اکبر کو خود تعلیم دیتے تھے۔ شاہیر سے رشتہ ملانا اور تعلق پیدا کر دینا ہر شخص باعث فخر سمجھتا ہے۔ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۷ء تک بجز والد اور چچا کے کوئی پوچھنے والا نہ تھا کہ ”یہ کھانا کیا ہے“ ”مرتب و مشہور ہونے کے بعد لوگوں نے اعلان کرنا شروع کیا کہ ہم اکبر کے استاد رہے ہیں۔“ فرماتے تھے کہ ”کچھ عرصہ ہوا تو ایک صاحب نے حیدر آباد (دکن) میں اعلان کیا کہ میں نے اکبر کو پڑھایا ہے۔ میں نے سنا تو کہا کہ ہاں مولوی صاحب کا ارشاد سچ ہے مجھے یاد آتا ہے کہ میرے بچپن میں الہ آباد میں ایک مولوی صاحب تھے وہ مجھے علم سکھاتے تھے اور میں انھیں عقل مگر دونوں ناماں رہے۔ نہ مولوی صاحب کو عقل آئی اور نہ مجھے علم“ سید صاحب میرے مکان پر کڑے آتے تھے یا میں عشرت منزل جاتا تھا تو حالات پوچھتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے کہا کہ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کا کچھ حال بیان فرمائیے تو فرمایا کہ والد صاحب ایک صوفی فن شخص تھے مجھے تصوف اُن سے ورثہ میں ملا ہے۔ والد صاحب انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، میں نے انگریزی جو کچھ سیکھی وہ پرائیویٹ طور پر سیکھی۔ غدر ہوا ہے تو میں انگریزی پرائمر پڑھ رہا تھا، بعد کو ذاتی محنت سے اس زبان میں اتنی

ترقی کر لی کہ بزمانہ جی عدالتی تجاویز انگریزی میں لکھتا تھا۔ والد صاحب کو حساب اچھا آتا تھا ایک دن والد صاحب کے سامنے ایک طالب علم نے ایک سوال نموریشن کا پیش کیا۔ میں نے کہا دیکھوں میں نکال سکتا ہوں۔ والد صاحب نے کہا کہ تم نے نموریشن نہیں سیکھی ہی بغیر اس کے قاعدوں کے علم کے تم کیسے نکال سکتے ہو۔ میں نے سوال کی نقل کر لی اور رات کو دیر تک اس پر محنت کرتا رہا تاہیں کہ اُسے حل کر لیا۔ صبح کو والد صاحب نے جواب صحیح دیکھ کر ذہانت پر بہت داد دی اور پیار کیا۔ والد صاحب کے بتائے ہوئے مجھے حسابی سوالات حل کرنے کے اب بھی خاص خاص ایسے گر معلوم ہیں جو دوسروں کو مشکل سے معلوم ہوں گے۔ مثلاً آپ ہزاروں لاکھوں کے اعداد مسلسل بولتے جائے میں لکھتا جاؤں گا اور بغیر تاخیر فوراً ان کا حاصل جمع بتا دوں گا۔ میں نے عرض کیا اچھا لکھیے ایک پرزہ پر۔ لکھنے کو تیار ہو گئے میں نے حسب ذیل اعداد بولے، رعشہ دار ہاتھ سے لکھے۔

۲ ۹ ۲ ۱

۷ ۵ ۰ ۶

۱ ۳ ۳ ۸

۵ ۹ ۸

سوال ختم ہونے کے ساتھ ہی درست جواب ۹۳۶۳ لکھ دیا۔
انگریزی کا استعمال تحریر میں اچھی طرح کر سکتے تھے مگر تقرر میں وہی تیز بٹیر آدمی اردو آدمی انگریزی جلتی تھی۔ کبھی تحریر میں بھی اردو انگریزی

کاپیوند لگانے تھے۔ مثال کے طور پر ایک پُرزہ کی نقل پیش کرتا ہوں جو مجھے شہر سے کٹرہ میں مکھن کے خعلق بیچا تھا ”پانچ پیسے بھر کم سیر بھر مکھن پہنچا Many thanks سیر بھر اور چاہیے حکم دے دیجیے۔ اکبر حسین، ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء“ اس پُرزہ سے زبان کے علاوہ خیال سود و زیاں پر بھی روشنی پڑتی ہے بازار کے گھی سے صحت اچھی نہیں رہتی تھی اس لیے مکھن فراہم کر کے اس میں سے گھی نکلوا کر استعمال کرتے تھے۔

حیدر آباد کے ایک علم دوست عہدہ دار عدالت مولوی حمید الدین محمود صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے دریافت فرمایا ”اجی خواجہ حسن نظامی صاحب کے شائع کردہ اکبر کے خطوط کیا ہیں سلسل علالت نامے ہیں، تمام خطوط میں سے چند ہی ایسے نکلیں گے جن میں خرابی صحت کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟“ میں نے کہا اول تو پیرانہ سالی ہی ایک مستقل بیماری ہے۔ مرحوم عادتاً ایک اصولی شخص تھے اور چیزیں خرید کر کھاتے رہنے میں بہت محتاط۔ البتہ اجاب کے تحفے آتھیں بیمار ڈالتے رہتے تھے ۵

خوشی سے میں نے کیے یفیس آم قبول
ادائے شکر میں اب ہو میرا سلام قبول
دوسروں کی حرص اور زیادہ خوری پر فقرے کہتے تھے ۵
میں نے سحری کھانے پر کل ٹوکا تھا وہ جھنجھلائے تھے
اور آج جناب واعظ نے چورن سے نقطہ افطار کیا

مگر ادھر ادھر کے آئے ہوئے تحائف سے اپنا منہ نہ روک سکتے تھے خود یہ مطبوعہ خطوط اس حقیقت کے شاہد ہیں - ۱۲ فروری ۱۹۱۶ء کو خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں ”لاٹ صاحب کے فشی صاحب نے تھوڑا پھلی کا قورمہ بھیج دیا تھا، میں نے تھوڑا سا کھایا رات کو طبیعت صاف نہ تھی ایک گولی چورن کی کھائی - جگر نے اپنے کام میں قصور کیا صفراوی دست آنے لگے دو دن بعد قبض شدید ہو گیا - سر میں دہ شدید چکر کہ الامان، راتیں مصیبت سے کٹیں، اب تک نجات نہیں ملی ” اس افادے سے آئندہ سبق لینا تھا مگر نہیں ہ

قضا کے راستے پر خود دل ناکام آتا ہے
ادھر کو پاؤں بڑھتے ہیں جدھر سے دام آتا ہے
(شاقب لکھنوی)

پھر ایک خط میں خواجہ کو لکھتے ہیں ”خواجہ بانو کو خدا خوش رکھے میرا خیال رکھتی ہیں گاجر کا حلوہ مجھ کو ناموافق نہیں ہے عمدہ گھی دودھاؤ شکر ڈال کر جو بنتا ہے وہ مجھ کو مضر نہیں ہوتا ” آخر عمر میں مسلسل بیمار رہنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ دوا بہت کم کرتے تھے متوجہ کرنے پر فرماتے تھے بیماری اپنا کورس پورا کرے گی تو خود چلی جائے گی طبیعت بھی بڑی حساس تھی خفیف سی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان مطبوعہ خطوط میں کم ایسے ٹیکس لگے جن میں کسی نہ کسی قسم کی خرابی صحت کا رونا نہ رویا گیا ہو، خود فرمانے ہیں ہ

اب ہی بیماری ہی اکبر اپنا شغل زندگی
جب فقط مرنا ہی باقی ہے تو اچھا کیوں رہوں

عہد جوانی | میں جس زمانے میں کلام اکبر پر تنقید کے سلسلے میں مضامین لکھا رہتا تھا (ملاحظہ ہوں مضامین مطبوعہ نقیب بدایوں از ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء) اور حیات اکبر کے واسطے مواد یکجا کر رہا تھا تو اکبر نے فرمایا تھا ہے

لکھو لائف مری ایام جوانی کے سوا
سب بتادوں گا تھیں افتدودانی کے

افتدودانی کے واقعات کو پردہ خفا میں رکھنے کا اعلان صرف شعر کی حد تک تھا ان کی تفصیل وقتاً فوقتاً بتاتے رہتے تھے غ
لائف جو میری لکھتے ہو، ہر اس میں بات کیسا
مرتہا رہا مہتوں پہ پھر ایسی حیات کیسا

۱۔ شادیاں | اکبر کی دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی پندرہ برس کے
سن میں ماں باپ نے ایک قصبائی ہم کفو سستی لڑکی
خدیجہ خاتون سے کر دی جو اکبر سے عمر میں چار سال بڑی تھی اکبر کا دل
اس سے کبھی نہ ملا بقول ایک ہزل گو کے ہے

باپ ماں نے پاؤں میں شادی کی بڑی ڈال دی
ورنہ بیوی کی قسم کھاتا ہوں میرا دل نہ تھا

اس عالی دماغ شاعر کا حسین و بلند تخیل جو سلیقے اور دل ربانیاں
چاہتا تھا یہ دمقانی سیدانی ان سے بالکل کوری تھی۔ اکبر کی پُر خروش اور

۱۵ "افتدودانی" حضرت شیخ سعدی کی اس عبارت کا ملکڑا ہر "در ایام جوانی
چنانکہ افتدودی دانی"

۱۶ جن اشعار سے پہلے "غ" علامت ہو ان کو غیر مطبوعہ سمجھنا چاہیے۔

دیوانی جوانی ایسی شوخ و شنگ ہستی کی تلاشی تھی جو اُن کے اس بلند
ذوق کی تکمیل کر سکے ۛ
کم سن مسوں سے آپ کسی شب نہ چو کیے
جیسی گھڑی ہیں یہ انھیں ہر روز کو کیے

حسین تو ہر وہ مروت نہیں اگر نہ یہی غضب کی آنکھ تو ہر لطف کی نظر نہ یہی

لیٹ بھی جا ارے اکبر غضب کی بیوٹی ہر
نہیں نہیں پہ نہ جاییسا کی ڈیوٹی ہر

اکبر دے نہیں کسی سلطان کی فرج سے لیکن شہید ہو گئے یگم کی نوج سے
جس دارفتہ مزاج کی نظریں حینان شہر کی ان اداؤں کی داد سے
چکی ہوں کہ ۛ

نزاکت پر غضب ہی اُن کا جوڑا اس قدر بھاری
دو پٹہ ہر مصیبت پائینچہ فسل سے اٹھتا ہر

اُن اُس بت نے اڑائی یہیں بلا بھولے
ہم تو ہم شیخ بھی توحید کا کلمہ بھولے

پنچری وعظ و ہذب کو لیے پھرتے ہیں
شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لیے پھرتے ہیں

ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں

ہم تو اک شوخ شکر لب کو لیے پھرتے ہیں

وہ بھلا ایک قدیم خیال روتائی سیدانی سے کیا خوش ہو سکتا تھا چند ہی سال کے اندر اکبر کا دل اس بی بی سے بھر گیا۔ الہ آباد میں امامیہ مذہب کے ایک متوسط الحال صاحب خوش سلیقہ میرا مداحین نامی رہتے تھے۔ ان کے ایک جوان، خوش رو اور خوش سلیقہ لڑکی فاطمہ صغریٰ تھی۔ اکبر کی نظر انتخاب اس پر پڑی۔ دوسری شادی کی خبریں سن کر خدیجہ خاتون کے قصبات اعتراض مارنے مرنے پر آمادہ ہوئے لیکن اکبر نے خدیجہ خاتون پر کچھ ایسا روغن قاز ملا کہ وہ خود ان کے دوسرے عقد پر راضی ہو گئی۔ دوسری بیوی کے گھر میں آتے ہی سوکنوں میں جھگڑے شروع ہوئے اور اکبر کی ساری ذہانت و عدالت منہ دیکھتی رہ گئی۔ آخر نئی بیوی نے فتح پائی۔ اکبر نے خدیجہ خاتون کو چالیس روپیہ ماہوار حوالے کر کے اپنے سے ایسا علیحدہ کیا کہ پھر مدت العمر ساتھ ہی نہ رکھا۔ خدیجہ خاتون سے دو لڑکے ہوئے۔ نذیر حسین عرف بدل میاں اور عابد حسین۔ نذیر حسین تو شادی کے پہلے ہی سال (سلاسلۃ) اس خاکدان حیات میں نصبت جھیلنے کو تشریف لائے۔ اکبر نے بیچ کہا تھا سہ

پیدا ہی نہ ہوتے کاش اطفال بہاں

یہ تو ناعق بلائے ہستی میں پڑے

بدل میاں لا ولد رہے۔ عابد حسین کے ایک فرزند عاشق حسین ہوئے۔ باپ اور تایا کی طرح نہ ان کی ٹھکانے کی تعلیم ہوئی اور نہ تربیت پیٹ کی مجھوری سے تنگ آکر نوعری میں نوکری کو نکلے۔ پہلے کچھ

دنوں ریلوے کے دفتر میں کام کیا اس کے بعد ایک قلیل تنخواہ پر
الہ آباد امپرومنٹ ٹرسٹ کے دفتر میں لوکر ہو گئے۔

پھرتی ہی جس کو گردشِ دؤراں لیے ہوئے
دل میں ہو وہ غریب کچھ اراں لیے ہوئے

میں نے ان لوگوں کو سید اکبر حسین صاحب کے پاس آتے یا سید صاحب
کو اُن کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ باہر تو باہر خاص
الہ آباد کے رہنے والے اکثر نہیں جانتے کہ یہ لوگ سان العصر
خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج کی اولاد ہیں۔ خدیجہ خاتون ان کو
کیلے سے لگائے تقریباً نصف صدی تک تنہائی کے دن کاٹتی
رہی بقول اکبرؒ

تم بہتری کی فکر کرو بزمِ غیر میں
عزلت میں ہم تو اپنی تباہی کے ساتھ ہیں

نذیر حسین عرف بدل میاں گو جوان تھے لیکن انکار و امراض کے عیش
بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔ صورت پر پریشان حالی برتی تھی۔ گلی چلتے
مرگی کے دؤروں سے گرتے تھے۔ راہ گیر از راہِ خدا ترسی اٹھالانے
تھے۔ دوا علاج بالائے طاق اُن کے پیٹ میں ہینوں میں چند
چٹانک لگی بھی نہ جاتا تھا جو دماغی و اعصابی ناتوانی کا کچھ بدل کر سکتا۔
اسی حالت میں وہ گورکنارے لگ گئے۔ جاں کنی کے وقت بیٹے نے
باپ کو بہت یاد کیا اور خبر کرائی مگر خدا جانے دل میں کیسی گرہ پڑی
تھی کہ نہ آئے اور اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں سے لڑنے والا منتظرِ بار
فرزند ہمیشہ کے لیے قبر میں جا سویا۔ ایک دفعہ اکبر حسین بیمار پڑے

خدیجہ بیگم نے حالت خراب سنی، بہت کر کے دیکھنے عشرت منزل آگئی۔ مگر حالات کی شدت اور واقعات کی اہمیت نے جد امجد کے خلد سے نکلنے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ فاطمہ صغریٰ کے انتقال کے بعد بھی تھوڑی بی بی زندہ رہیں ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا لیکن اس وقت بھی انھیں عشرت منزل میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے ہماری قیمت وہی رہے گی (اکبر) میں بعض واقعات سوچتا ہوں تو سخت متحیر ہوتا ہوں کہ جس خوش فہم بی بی نے اکبر کے دل کو اپنی محبت اور قوت نفوذ کی ریشمی ڈوریوں سے اس طاقت سے باندھا تھا کہ زندگی تو زندگی مرنے کے بعد بھی اُس نے شوہر کو مرکز سے جنبش نہ کرنے دی وہ عقائد کے معاملے میں ان کو متزلزل کرنے میں کیوں ناکام رہی۔ جتنا زمانہ زیادہ گزرتا گیا اکبر حنفی عقائد میں نہایت متشدد ہوتے گئے۔ بعض بعض اوقات اُن کا اہل تشیع کو مسلسل مرکز طعن و تشنیع بنائے رکھنا ناگواری کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی طرح خدیجہ خاتون کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل ان کے مخصوص احباب کو کسی طرح دل سے پسند نہ تھا۔ یہ لوگ کبھی کبھی منہ پر کہنے کی ہمت کر جاتے تھے۔ مولانا محمد علی صاحب ناسی پروفیسر میوزیم سنٹرل کالج نے ایک دن کہا سید صاحب، آپ پہلی بی بی سے اب اتنے کشیدہ ہیں، کبھی وہ آپ کی تنہا بی بی تھیں یا نہیں، اُن سے اولاد ہوئی یا نہیں، آپ اُن سے ملتے تھے یا نہیں اس پر جواب دیا: ”جی، بے دلی سے ملنے کا کیا ہوا، یوں تو میں روزانہ چند منٹ کو پانچاٹھ کے واسطے بھی قدمچوں پر ناک بند کر کے بیٹھا کرتا ہوں۔“

یہ دوسری بی بی فاطمہ صغریٰ (جو بعد میں اکبری بیگم کہلائیں) اپنی
میں جن کو اکبر کا ذوق ایک زمانے سے تلاش کرتا تھا۔ ان کو اپنی تمام محبت
و محبت کا محور گردانا، ان کی اسی سلیقہ مندی نے اکبر سے اعتراف کرایا کہ

مستی میری تھی ہی کیا بس ایک ورق سادہ
رنگین بٹھا ہوں نے رنگین سنا ڈالی (جگر)

یہ گھر میں کیا آئیں گلشنی آئی۔ آئے دن دولت اور عزت میں اضافہ
ہونے لگا۔ ان کے انتقال کے بعد ایک دن بچوں کی طرح ابدیدہ ہو کر
کہنے لگے "عشرت منزل ان کے دم تک عشرت منزل تھی، اب نہ وہ
سامان عیش ہی نہ اجاب کا اجتماع، نہ دل کو اطمینان ہی نہ جسم کو راحت
ناہنجار نوکر دوں کے رحم و کرم پر مردہ بدست زندہ ہوں۔ ہائے
چل بے اسباب راحت چشم عبرت رو چکی
میری مستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی"

پھر فرمایا

اب تک ہی انھیں حالت سابق کا تصور

یاروں نے میرا خانہ ویراں نہیں دیکھا

فاطمہ صغریٰ سے عشرت حسین اور ہاتھ دو اولادیں ہوئیں۔ عشرت حسین
کو ولایت بھیجا، وہاں انھوں نے کئی سال صرف کر دیے۔ اس پر دل دہ
نظمیں لکھیں اور جلد واپسی کی طرف متوجہ کیا کہ ع
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

کیا اس کا انتظار ہی کہ ع

ماں خستہ حال ہوئے بے چارہ باپ مرے

عشرت حسین صاحب واپس آئے، ڈپٹی کلکٹر ہوئے، اب پٹن لے لی
 ہے۔ عشرت حسین صاحب کی شادی شیخ احمد حسین صاحب رئیس پریانوان
 کی لڑکی سے ہوئی۔ نواب احمد حسین صاحب پہلے حنفی مذہب رکھتے
 تھے، انھوں نے شادی ایک شیعہ خاندان میں کی۔ تھوڑے عرصے
 بعد امامیہ مذہب اختیار کر لیا۔ اکبر حسین اس پر اُن کو تو مومن سمجھی
 کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ بعض لوگ دریافت کرتے ہیں کہ کیا
 عشرت حسین صاحب شیعہ ہیں؟ میں اُن سے کہہ دیتا ہوں کہ میرے علم
 میں نہیں ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں ایک اڈیٹر نے شائع کر دیا تھا کہ عشرت
 حسین صاحب شیعہ ہیں۔ یہ سن کر سید عشرت حسین صاحب نے اپنے والد
 کو ایک خط انگریزی میں لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: ”میرے شیعہ ہونے
 کی خبر سے زیادہ کوئی خبر لغو، ہل اور غلط نہیں ہو سکتی۔ میں نے اقبال
 کو لکھا ہے کہ وہ پرچہ جس میں تم نے یہ خبر پڑھی مجھ کو روانہ کر دو۔ اگر
 ایسی خبر دروغ چھپی ہے تو میں نہایت زور سے اس کی تردید شائع
 کروں گا اور میں اس کا تفحص کروں گا کہ اس خبر کا مصنف کون ہے۔ میں
 اس قسم کی بات کو دبا دبا یا نہ چھوڑوں گا۔ اصل یہ ہے کہ تیرے میرے
 عقیدے کا تجسس اُنھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جو مذہب کو محض نمائندہ
 سمجھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ فلاں شخص ہمارے گروہ میں آگیا۔ اکبر
 مرحوم نے سچ کہا ہے۔“

پہلے سنتے تھے صدائیں مردِ میداں کون، ہے

اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گونیاں کون ہے

۱۔ ملاحظہ ہوں خطوط اکبر مطبوعہ خواجہ حسن نظامی صاحب -

۲۔ کوچہ حور و شاں | میں جب اکبر کے نحیف جسم اور غیر معمولی روشن
دماغی پر غور کرتا ہوں تو دل میں کہتا ہوں کہ اگر

یہ اپنی ذہنی اور جسمانی توانائی کے بہاؤ کو مختلف راستوں سے بچا کر ایک
سُرخ یعنی خدمتِ ادب کی طرف مرکوز کر دیتے تو کلیات کے علاوہ خدا
جانے دنیا میں اور کیا کیا عجائبات چھوڑ جاتے۔ کہتے ہیں۔ ع

جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار بکڑا تھا

کاش یہ تھوڑا سا بیگار کا زمانہ بھی بے کار نہ جانا! مگر شاید قدرت
اس زمانے کو بھی ایک حد تک باکار بنانا چاہتی تھی کہ اس نباض کے منہ
سے جو کلمہ حکمت نکلے وہ اس کے تجربے کی کسوٹی پر کسا ہوا ہو۔ بام
خورشید رُخاں کا تجربہ خود اس دل دادہ حسن کی زبان سے سُنیے ۵
بسر کیوں نہ ہو عشقِ خواں میں اکبر خدا ہی نے دی ہر طبیعت کچھ ایسی

مبتانِ خود فروش آخر فرستاد نآبِ بل ہا | طلب کرد نذر چندان کہ خونِ قادِ دل ہا
(Bill)

حاکمِ دل بن گئی ہیں یہ تھیر والیاں | میں لگاؤں گا گلِ داغِ جگر کی ڈالیاں
ضبط کے جامے کے بچے ٹوٹتے ہیں دستوں | ہائے سیلیں کشیدے اور ایسی جالیاں
فول کہتی ہیں یہ مجھ کو میں نہیں سمجھا ہوں چل | ہیں گلِ رنگیں سے بہتر ان گلوں کی گالیاں
(Fool)

بھائی مجھے بات کل یہ بی منی کی | تفریق اٹھا دو شیعہ دُستی کی

کون آرام سے دنیا میں ہو گھر کے سوا | سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہر شوہر کے سوا

ہرج کیا ہم بھی جو شیم سرگیں پر پلے یہ بلائیں اس تماشکاہ میں تھیں کس لیے

ہمارے دم سے تابندہ بتوں کے بالے مجھ سے ہیں
ہیں نے ان کو چمکایا ہمیں دوزخ کے گندے ہیں

مجھ میں اظہارِ محبت اُن میں اظہارِ کمال میں وہاں رُسنے گیا اور وہ کہیں گانے گئے
حسینوں سے ارتباط کے بارے میں خواجہ حسن نظامی صاحب
کا ایک دلچسپ نظریہ نظر سے گزرا، وہ بھی سن لینے کے قابل ہو خواجہ
صاحب فرماتے ہیں جب عورت میں فلم ایکٹرس کی خوبیاں دکھائی نہیں
دیتیں تو مرد محض تفریح کے لیے بازاری عورتوں کے پاس جاتے
ہیں صرف اس نیت سے کہ تفریح سے دل و دماغ میں قوت بڑھے
گی اور بیوی بچوں کے لیے زیادہ محنت کے ساتھ روزی کمائی جاسکے
میرے خیال میں یہ طنزِ حقیقت سے بالکل بیگانہ نہیں۔ یہ
بات کچھ اُس زمانے کے فیشن میں داخل تھی کہ لوگ خوش رو اور خوش گلو
مہتیوں کو سامانِ راحت و امارت سمجھ کر ساتھ رکھتے تھے۔ اکبر کی طبیعت
کی جودت کا عجیب حال تھا، نچلا بیٹھانا نہ جانتی تھی۔ یہ اس سے خود تنگ
تھے فرماتے ہیں ۷

کان میں بات بزرگوں کی ساقی ہی نہیں
ناک میں دم ہر جوانی کے خریداروں سے

میرے دوست مولوی شیخ ارشاد حسین صاحب دکیل جدر آباد
نے ایسے عاشقانہ جنون کا اچھا نوٹو کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں ۷

صفائی تیرے عارض کی ہر ایسی کہ آئینے کو بھی سکتہ ہوا ہے
 امان کے قدر دانوں میں ایک مسلمان ڈپٹی بھی تھے۔ وہ اکبر کے اثر کو
 توڑتے رہتے تھے۔ آخر میں بدفرنگی زیادہ ہو گئی تو انھوں نے اپنے عہدہ
 اور اثر سے کام لے کر الہ آباد سے اکبر کا تبادلہ کر دیا۔ مشہور ہے کہ:-
 ”شاعر جو رنج و گدگد ہوا“ اکبر نے اپنے جلے دل کے پھپھوٹے یوں
 پھوڑے۔ غ

عزیزوں کی محبت ہمنشیں کی یاد سے چھوٹے
 امان کی ادا ہائے ستم ایجاد سے چھوٹے
 کی ایک دختر نو زاد سے چھوٹے
 میاں کھجور کی فرمائش سے اور ارشاد سے چھوٹے
 الہ آباد ہم سے ہم الہ آباد سے چھوٹے
 جوانی کی ہوا سے کون محفوظ رہا ہے۔ اکبر کو بھی یہ ہوا کچھ لگی۔
 لیکن توفیق رب نے عہد کو سبب خیر بنا دیا اور یہ طوفانی جوانی کے
 زمانے میں اس غرق کرنے والے ماحول سے صاف نکل گئے ع
 ما خدا داریم مارا نا خدا درکار نیست

۳۔ مشق سخن اور شاعری کے جلسے | اکبر موزوں طبیعت ابتدا ہی
 سے تھے۔ ذوقِ فطری جھڑپا تھا تو اشعار کہتے تھے۔ ابتداً درڈ سود تھ کی طرح فطرت ہی کو اپنا استاد
 بنایا۔ لیکن بعد کو جو روگی کو بھایا وہی بید نے بتایا۔ استاد بھی ملا تو اپنے
 ہی جیسا شوریدہ سراور وارفتہ مزاج۔ میری مُراد وحید میاں سے
 ہے۔ وحید میاں مولوی امیر اللہ صاحب دکیل کے بیٹے تھے کٹرے

کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں آتش سے استفادہ کیا تھا۔ والد کی وکالت کے سلسلے میں الہ آباد میں قیام رہتا تھا۔ الہ آباد کی کوئی حسین اور خوش کلو طوائف ایسی نہ تھی جس کے یہاں نہ جاتے ہوں۔ بلا کے حُسن دوست تھے لیکن بدکاری سے کوسوں دُور۔ امان، نصیبین اور بتن کے ہاں زیادہ جاتے تھے۔ ۲۵ سال کے سن میں پندرہ سالہ اکبر کو ساتھ لیے ہوئے ہاتھ کی ایک انگلی کا ناخن دانتوں میں چباتے ہوئے بتن کے کوٹھے پر چلے جا رہے ہیں۔ کہا: کیا کر رہی ہو، ذرا ادھر تو آؤ، کچھ اشعار کہیں۔ وہ زیر لب تبسم کے ساتھ ناز سے آئی۔ مضامین کی بارش شروع ہوئی۔ چند اشعار لکھے اور شکر یہ ادا کرتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ ایک دن نصیبین کے یہاں پہنچے، وہ خربوزہ کاٹ رہی تھی اس منظر نے ہی ایک شعر دے دیا، وہیں فرمایا ہے

مصرف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے
رکھ لیجے گا دل بھی ہمارا تراش کے

وحید میاں نہایت بلند شعر کہتے تھے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں ۵

اقبال نے دوستی بنا ہی منہ دیکھ کے رہ گئی تباہی

معفرت یوں پوچھتی ہر حشر میں مجھ سے وحید
وہ فدائے نامِ پاکِ پنجتن کیا ہو گیا
شمع کے گل ہوتے ہی پڑنے سب رخصت ہو گئے
دُفت کیا تھا میانِ انجمن کیا ہو گیا

اس دل کی ہر بہار و خزاں اُن کے ہاتھ میں
 گلشن بنا دیا کبھی ویرانہ کر دیا
 مجھے یہاں وحید میاں کے کلام کو تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔
 جن صاحبوں کو مطلوب ہو وہ انجمن ترقی اردو کو لکھیں۔ وہاں سے مرحوم
 کا کلام شائع کیا جا چکا ہے۔ ان کا بیشتر کلام تہگ کی نذر ہو گیا۔ خود ان کی
 جان بھی اسی میں گئی۔ جس کمرے میں دیوان رکھا تھا اُس میں آگ لگی دیکھتے
 ہی ارے میرا دیوان، ارے میرا دیوان کہتے ہوئے اندر گھس گئے۔
 اختلاج کے مریض، دھنوں سے دم گھٹ کر بے ہوش ہو گئے۔ باہر نکالے
 گئے تو جسم سے جان مفارقت کر چکی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک تیس سالہ
 ہونہار شاعر دنیا میں اپنی جگہ خالی کر گیا۔ انوس۔ ع
 دفعتاً کیا تھا مسبان انجمن کیا ہو گیا
 زندگی میں اکبر کو وحید میاں کا تھوڑا فراق بھی گوارا نہ تھا، شکوہ کرتے رہتے
 تھے۔

وحید صبح بنارس کی موج میں ہیں پڑے
 بھلا وہ کرنے لگے کیوں اودھ کی شام قبول
 اس شفیق کے انتقال کے بعد اکبر کا شاعری میں کوئی رہبر نہ رہا۔ زمانے کی
 رفتار کو دیکھتے ہوئے سمجھ لیا کہ اب تغزل میں چلنا کوہ کنڈن و کاہ براؤرن
 ہے۔ لہذا اس جادہ سے مڑ کر تفنن سیاست اور تصوف کی راہ پر پڑے۔
 تفنن کے لیے مغربی تمدن کا ایسا نیا میدان ڈھونڈا کہ اس کے موجد بھی ہو
 اور خاتم بھی۔ اقلیم شاعری میں یہ زمین ایسی اپنی کہ شفعہ کا دعوئے دار
 حقیقی اب تک پیدا نہ ہوا۔ اور تو اور خود ڈاکٹر اقبال نے تقلید کی کوشش

کی مثلاً ۵

مہری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں
ووٹ تو لٹائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا

مگر بقول اکبر مرحوم ۵

ہمارا شیخ جی کا کیا بھلا جوڑ کجا کھیوٹ کجا دیوان حافظ
صاف معلوم ہو گیا کہ یہ کامیاب نقل نہیں ہے۔ آخر یہ رنگ چھوڑنا پڑا۔
اکبر نے پہلے ہی پیشین گوئی کر دی تھی ۵

میری طرزِ فغاں کی بواہوس تقلید کرتے، میں
نخل ہوں گے افتر کی بھی اگر امید کرتے ہیں

ایک دن میرے وطن بدایوں سے ایک صاحب نے مجھے الہ آباد

ایک خط بھیجا۔ اس میں یہ اشعار لکھے ۵

میلی سی شیردانی ہو بوسیدہ بینٹ ہو چہرہ پہ پاؤ ڈر ہو نہ پاکٹ میں سینٹ ہو
سرکار اس کو خان بہادر کہا کرے ہم تو یہی کہیں گے کہ انسلاوینٹ ہو
اور دریافت کیا کہ یہ اشعار اکبر حسین صاحب کے ہیں، یہاں بدایوں میں
مشہور ہو کہ اکبر نے کہے ہیں اور فلاں صاحب پر چوٹ کی ہے۔ میں نے
عشرت منزل جا کر دریافت کیا۔ بولے، استغفر اللہ میں ان صاحب کو
جانتا بھی نہیں۔ میں تو دنیا کی غلط بحثوں سے بے حد تنگ آ گیا ہوں۔
دنیا میں کوئی بھی گوز لگائے، خوش عقیدہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی منجانب
اکبر حسین ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کے بھی تمام اشعار میں عطر
عنبر کی بو نہیں آتی۔ یہ چاروں مصرعے کسی کے بھی ہوں ایسے بدبودار
تو نہیں ہیں جیسی آپ ناک بھوں چڑھاتے ہیں ” در دستِ گبر آئینہ کار

نمی شود (بیدل) فرمایا: اجی - ع

نہ ہر کہ ہیٹ بیوشید مٹری داند

وید میاں جب تک حیات رہے مقامی شاعری کے جلسوں کی زندگی بنے رہے۔ الہ آباد میں اُس زمانے میں چار اصحاب اپنے اپنے مکانات شعر و سخن کے جلسوں کے مراکز بنائے ہوئے تھے۔ مولوی محمد غلام غوث صاحب میر غنشی دفتر گورنر، میر سجاد علی صاحب راجہ پوری وکیل ہائی کورٹ، دائرہ شاہ اہل کے ایک مرشد شاہ امین صاحب قیصر اور سید عابد علی صاحب بی۔ اے، ایل ایل۔ بی۔ اکبر کی نو عمری میں فارسی کا اچھا چرچا تھا۔ ایک دن کچھ اجاب غنشی غلام غوث صاحب کے پاس جمع تھے۔ خاقانی کے اس شعر کی داد دی جا رہی تھی۔

اے بت من تو قدر دل بشناس

ملک خانہ خدا شد

رائے یہ قرار پائی کہ اس زمین میں وہیں اسی وقت طبع آزمائی کی جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی غلام غوث صاحب نے اپنا مطلع سنایا۔

آفت گبر دیار سا شد

چشم بد دور خوش ادا شد

لوگوں نے بہت داد دی۔ لیکن جب سید اکبر حسین صاحب نے اپنا یہ عارفانہ مطلع سنایا۔

اے کہ مرد در را دوا شد

نمک زخم من چسرا شد

تو لوگ جھومنے لگے بڑی تعریفیں ہوئیں۔ دوسرے لوگوں کی ہمتیں بہت گئیں۔

پھر اس کے بعد اس زمین میں کچھ نہ کہ سکے۔ سید عابد علی صاحب کے مکان نے تو آخر میں ایک مستقل علی کلب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ذوالقدر صاحب ڈپٹی، مولوی خلیل الدین صاحب طبیب، الطاف حسین صاحب جوپوری، مولوی فرید الدین صاحب وکیل، مولوی بدیع الزماں صاحب زمیندار شہزادہ قیصر بخت صاحب، مولوی عزیز الدین صاحب انگر چٹے ہوئے ہم مشرب جمع ہو گئے تھے۔ شاہ امین الدین صاحب قیصر اور مولوی عزیز الدین انگر کی آپس میں رقیبانہ چشمک چلتی رہتی تھی۔ اکبر انگر کے طرفہ تھے اور ان کی دوستی میں دائرے کے اس مرکز ارشاد و تصوف قیصر پر چھپ چھپ کر طعن و تشنیع کے تپنے جلاتے رہتے تھے۔ ایک دن سید عابد علی صاحب کے مکان میں مشاعرہ ہوا۔ مصرع طبع تھارے۔

چھت جو گرتی ہی تو شہتیراٹ جاتا ہی

اکبر نے انگر کی خاطر ایک غزل لکھ کر ہوٹل کے ایک ملازم کو انائی کو۔ پڑھنے کو دے دی۔ اس شعر میں شاہ امین الدین صاحب پر چوٹ تھی۔

شب کو تنہائی میں پڑھتا ہی نماز معکوس

صبح ہوتی ہی تو ایک پیراٹ جاتا ہی

قیصر سن کر سوخت ہو گئے۔ تہذیب و ممانت کا بارہ غصہ کی گرمی سے جنون کے معیار تک چڑھ گیا۔ وہیں مشاعرے میں دو غریباں شر لکھ کر ایک شاگرد احمد شاہ کو دیے۔ انھوں نے کوا اور انگر سے مخاطب ہو کر دلیری کے ساتھ پڑھ دیے۔

دیک میں ڈال کے کفگیراٹ جاتا ہی

غیر اگر تیری ہم... اٹ جاتا ہی

جب مسالا نہیں پاتا ہی تو کوا انائی

ای شرابی تیری غیرت پہ ہزاروں فسو

پانی اُسی طرف بہا جدھر نشیب تھا۔ انگر سنتے ہی آگ ہو گئے ضبط نہ ہو سکا
 ”پھر تو پڑھ“ کہتے ہوئے آتینیں چڑھا کر بڑھے۔ اب کیا تھا مٹت مٹت
 شمع ہو گئی۔ بزمِ شاعرہ جائے مجاہد بن گئی۔ یہ ہنگامہ دیکھا تو اکبر گھر کی
 طرف لپکے۔ بقول بیڑ صب شاہجہانپوری ۛ

اُٹھے جو مارنے کو وہ ہنٹریے ہوئے
 بھاگے وہاں سے ہم دل مضطرب ہوئے

یا بقول ریاض خیر آبادی ۛ

چھیڑ کر مجمعِ زہاد کو ڈھونڈتا ہوں ریاض
 کہنہ مسجد کی طرح ہونہ مرمت میری

اس ہنگامے نے اتنا اثر ضرور کیا کہ اکبر نے آئندہ شاہ صاحب کو چھیڑنے
 سے کان پکڑ لیے۔ آخر عمر میں انقلابِ زمانہ کی ہوا اور پیری کی فضا نے
 اوراقِ عافیت کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ عام صحبتوں اور شاعرِ دل کی ٹکرت
 سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ گاہے ماہے شریکِ شاعرہ ہوتے تھے وہ
 بھی زیادہ تر میر سجاد علی صاحب کے یہاں راجہ پور کے شاعروں میں۔
 ۱۹۲۱ء میں مرضِ الموت میں مبتلا تھے۔ میر سجاد علی صاحب نے دعوتِ
 نامہ بھیجا، اس کے ساتھ رساؤل بھی روانہ کی بلوجہ علالت شریکِ شاعرہ
 نہ ہو سکے۔ طبع میں غزل روانہ کر دی جس کا مطلع یہ تھا۔ غ ۛ

ہو بیاں کیوں کر غایتِ حضرتِ سجاد کی
 لذتیں لوں گا میں آردِ رساؤلِ زاد کی

تلاشِ معاش و ترقی | انبان خواہ کیسا ہی سعی کو سرا ہے اور خود
 کو مختار سمجھے لیکن غور سے دیکھے تو یہی

نظر آتا ہو کہ سراسر بہتہ بہ قیمت است ۔ ہوا و حوادث اس کو جس طرف
لے جاتے ہیں، جاتا ہو۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہو ۛ

چنداں کہ دست و پا زدم آشفۃ تر شدم
ساکن شدم میسانہ دریا کنار شد

سچ پوچھیے تو حوالگی خسل ہو۔ یہ ہو جائے تو خود لہریں کنارے لگا دیتی ہیں۔
اکبر کی زندگی اس اجمال کی تفصیل ہو۔ دیکھیے معاشی زندگی کہاں سے شروع
ہوتی ہو اور حالات کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں ۛ

مجھے تو اپنی ترقی میں غور کچھ بھی نہیں
خدا کے نام کی برکت ہو اور کچھ بھی نہیں

گھر پر ابتدائی تعلیم جو کچھ ہوئی وہ معمولی شرقی۔ اور ظاہر ہو کہ جب کوئی
مروجہ اسنادی علم نہ حاصل کیا ہو تو بڑی نوکری کیسے لے۔ بندرہ برس
کی عمر میں گلے میں سنت پیغمبری کا طوق بڑھ چکا تھا۔ بے روزگاری میں
یہ بوجھ اور سبب کا ہش جان تھا۔ دو برس تک کوشش کرتے رہے
لیکن کہیں چار پیسے کا سہارا نظر نہ آیا اور پریشانیاں بڑھتی رہیں۔ خود
فرماتے ہیں ۛ

کچھ لوہوں میں ہو پریش گریجو میٹوں کی سڑک پہ مانگ ہو قلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہو قدر تو کچھ علم دین تقویٰ کی خرابی ہو تو فقط شیخ جی کے میٹوں کی

سید بننا ہو تو بنو سر سید ہونا ہو خاں تو تم ہو انگریزی خاں

لطف چا ہو اک بت نوخیز کو راضی کرو نوکری چا ہو کسی انگریز کو راضی کرو

انگریز دانی کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی۔ اکبر اس زمانے میں ”چار دونی آٹھ“ سے تو آگاہ تھے لیکن فاکس معنی لومڑی کی دم سے بھی واقف نہ تھے۔ ایسے آڑے وقت میں لومڑی کی نہ سہی دمڑی کی کیفیت نے کچھ کام نکالا۔ الہ آباد میں ۱۷۷۷ء میں جننا کا پل بن رہا تھا ٹھیکہ دار کو ایسے نشی کی ضرورت تھی جو اینٹیں ڈھونڈنے والے مزدوروں کو کوڑیوں کی شرح سے حساب کر کے روزانہ پیسے تقسیم کر دیا کرے۔ اس عہدہ جلیلہ کے لیے قرعہ فال اکبر کے نام پڑا۔ پندرہ روپیہ ماہوار کی صورت نظر آئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جننا کا پل ساری عمر تو بنتا نہ رہتا، تھوڑے عرصے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو ریلوے کی طرف منج کیا۔ ۱۷۷۹ء تک ریلوے کلرک رہے۔ اس زمانے سے خانگی طور پر انگریزی سیکھنے کی طرف توجہ کی۔ ۱۷۷۹ء میں وکالت درجہ سوم کا امتحان دیا، کامیاب ہو گئے۔ کچھ دن پریکٹس کی۔ ۱۷۷۹ء میں نائب تحصیلداری کی ایک عارضی خدمت ہاتھ آگئی۔ چند ماہ بعد داروغہ آبکاری ہو گئے۔ اس سلسلہ کے اختتام پر ہائی کورٹ میں سل خوانی کی جگہ مل گئی۔ اس پر تین برس تک جم کر کام کیا۔ یہاں انگریزی کی مشق کے ساتھ مزید قانون کی تیاری میں مصروف رہے۔ ۱۷۷۹ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور پریکٹس کرنے لگے۔ تھوڑے عرصے بعد منصفی میں منتخب ہو کر ماتھرس چلے گئے۔ یہاں محکم اور پبلک کے دل میں اپنی کار دانی اور لیاقت کا اچھا رنگ بٹھایا کہ ایک ایک دن میں تین انٹیس مقدمے فیصل کیے۔ گورنمنٹ نے قابلیت کا اعتراف کیا اور سب ججی کے واسطے منتخب کر لیے گئے۔ سب ججی کے زمانے میں رستم جی نامی

لے کالج واسکول کی بجتی ہر سو تو مڑی جار دونی آٹھ ہیں اور فاکس معنی لومڑی

ایک پارسی ڈسٹرکٹ جج تھے۔ اسی زمانے کا یہ شعر ہے
 عکس سب جج دب گیا تصویر جج کے سامنے
 اکبری دربار رستم کا اکھاڑا ہو گیا

سب ججی سے ججی کی کرسی پر پہنچے اور اضلاع سے گھوم گھام کر پھر الہ آباد
 آگئے۔ جب تک علی گڑھ میں رہے سرسید سے خوب ٹوک جھوک رہی۔ اُن
 کے علم و خلوص کی دل سے قدر کرتے تھے مگر یہ یقین رکھتے تھے کہ مسلمان
 جس تیزی کے ساتھ یورپین تہذیب سے متعارف کرائے جا رہے ہیں
 وہ شدت اپنا مضر رنگ لائے بغیر نہ رہے گی اور مسلمان بالآخر دین
 سے بیگانہ ہو جائیں گے۔ فرماتے ہیں :

ناز بے وضو سے رو رہی ہو اک طرف مسجد اُدھر قرآن ہے رغبت دل مذہب کا سپاہ

سراسر نورایاں بسایہ پر قربان کرائے یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے بس لگا

کہا کسی نے یہ تید سے آپ ای حضرت
 جواب اُنھوں نے دیا ہم ہیں پر و قرآن
 جواب حضرت سید کا خوب ہو اکبر
 ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر
 زبانی کہتے ہیں بس کچھ مگر حقیقت میں
 سرسید صاف کہہ دیا تھا :
 مغربی پارک میں چکر کے سوا کچھ بھی نہیں

دل رنگیں کی ہوا کھا د بڑی سیر یہ ہر

ہر گام پر جو طاعت حق سے الگ پڑا ہوتے رہو گے مرکز قومی سے تم بید

بٹھائی جائیں گی پرے میں بیابان کتبک بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کتبک
غرض کہ سرسید کی اس آزاد خیالی میں ان سے کبھی متفق نہ ہوئے۔
دیکھیے ان حالات میں اُن سے اختلاف کی داستان ان چار مصرعوں
میں کس بلاغت سے بیان کی ہو ۵

حاضر ہوا میں خدمتِ بند میں ایک آت افسوس ہو کہ ہونہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پر دین کی اصلاح فرض ہو میں چل دیا یہ کہ کے کہ آداب عرض ہو
یہ بھی کسی طرح گوارا نہ تھا کہ تنگ خیال مولوی صاحبان سرسید کو کافر
کہیں کہتے تھے کہ سرسید کی نیک نیتی اور ایثار کے صلے میں خدا تو انھیں
جنت دے مگر خلد کے ٹھیکہ دار مولوی انھیں جنت میں نہ آنے دیں
مولوی صاحب نہ بخشن گے خدا کو بخش دے

گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت نید لٹھلے کے امام ابو حنیفہ دوڑے
الہ آباد کی سٹن ججی کے زمانے میں اعلیٰ قسم کی اخلاقی جرأت کا ثبوت
دے کر ایک مقدمے کا فیصلہ کیا۔ حبیب اللہ صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ
پولیس رشوت ستانی میں ماخوذ ہو گئے تھے۔ مقامی فضا اُن کے سخت
خلاف تھی۔ سید اکبر حسین صاحب نے اُن کو صاف بری کر دیا۔ دطن میں
بے لاگ کام کرنا نہایت دشوار تھا لیکن اُنھوں نے سفارشوں کو
بالائے طاقت رکھ کر انصاف کر کے بتا دیا۔ ایک دن قادر کان میلا

یعنی اُن گلیوں کا ساتھی جن میں جوانی کھوئی تھی، ایک مقدمے میں سفارش کے واسطے پہنچ گیا۔ پوچھا، سچ بتاؤ اس میں تم کو کتنا ملے گا اُس نے کہا دس روپیہ۔ ایک دس روپیہ کا نوٹ جیب سے نکال کر دیا اور کہا یہ لے جاؤ، اب سفارش سے سروکار نہ رکھو۔ وہ راضی ہو گیا۔ اجاب کے ذریعے صبح رہبری ہو جاتی تھی تو تجویز بدل بھی دیتے تھے۔ یہ جب کانپور میں صدرِ اعلیٰ تھے تو چمیدی میاں ایک ہندو بزاز کی سفارش کو پہنچ گئے۔ تجویز بزاز کے خلاف لکھ چکے تھے۔ فصل حالات سے باخبر ہونے کے بعد تجویز چاک کرادی اور بزاز کی موافقت میں از سر نو تحریر کی۔ سشن ججی سے ہائی کورٹ کی ججی کے واسطے بھی نام زبانوں پر آنے لگا تھا لیکن اس کرسی تک پہنچنے کا موقع نہ آیا کہ ۱۹۵۰ء میں پنشن کا وقت آگیا اور اپنے مستقل عہدہ ججی خلیفہ الہ آباد سے پنشن پر سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ نے جوڈیشل خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب عطا کیا اسی سال الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی منتخب ہوئے۔ پنشن کے بعد پورے پانچ سال بھی اطمینان کی زندگی نہ گزار سکے تھے کہ غیب سے سنگ آمد و سخت آمد۔ اور یہ تاجر بھی کہاں لگا۔ سب سے زیادہ دکھتی رگ پر ۱۹۵۰ء میں عشرت حسین کی والدہ پنچہ قضا کی گرفت میں آگئیں۔ اکبر کے خاوند دل میں صف ماتم بچھ گئی۔ اس چوٹ کے احساس نے چار مصرعے کیسے آئیے۔

حقیقت کھوایے ہیں۔ فرماتے ہیں ۵

آبادہ حریف ہیں ستانے کے لیے اور دُکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
 زندہ ہوں تو مجھ پر ہنسنے والے ہیں بہت مر جاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

دیگر

اٹھڑا اُس درد سے جو مشتعل ہو کر رہے

الاماں اُس یاد سے جو زخمِ دل ہو کر رہے

اس صدمے نے قلب کو ایسا مجروح کیا کہ دو برس بعد تک گھاؤ کی یہ حالت تھی ”میرا دل خون ہی لیکن آسمان دامنِ یار کو اسی خون کی گوشت سے زینت دینا چاہتا ہے تو کیا چارہ ہے“ (خط مورخہ ۳ مارچ ۱۹۱۲ء بنام خواجہ حسن نظامی صاحب) میسرے ماموں تولا حسین صاحب کا شعر ہے

ہو عمر زیادہ ترے سامانِ ستم کی کچھ تیر ہیں چٹکی میں جو ہم یاد ہوئے ہیں (تولا)

اکبر حسین جس آسمان کی خط میں شکایت کرتے ہیں اُس نے جون ۱۹۱۳ء میں انھیں پھر یاد کر کے ایک تیر اور سر کیا۔ اس مرتبہ مجروحِ دل کا بھایا چار دہ سالہ ہاشم قبر میں اتارا گیا۔

میں تیرے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا مائے ہیں تیر

سب دہانِ زخمِ مُتَجَلو مرجا تھنے کو ہیں

اس آخری خدنگِ بلا نے اکبر کی نظر کا زاویہ بالکل سیدھا کر دیا۔ خواجہ

صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”سینے میں ابھن، دماغ میں گرمی

محسوس ہوتی ہے۔ بہت کم روتا ہوں لیکن دل ہر وقت بھرا ہوا

اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی رہتی ہیں، کوشش کرتا ہوں

کہ ہاشم کے بدلے ہاشمِ آفریں کا تصور کر کے اُس سے فریاد کروں اور

مدد چاہوں لیکن وہ بھولی صورت اور پیاری آواز جہنمِ دگوش پر

ہنوز محیط ہی۔ پھر اُس بچے کے ارمان، اُس کی بے بسی، اُس کا اللہ اللہ کرتے رہنا، نازوں کو چھوڑ کر اس چودھویں سال کی عمر میں بے کمانہ اور عاجزانہ فریاد پر آجانا، معاذ اللہ ان باتوں کی یاد دل پر بجلیاں گراتی ہو وہ لڑکا میری طبیعت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ پڑھتا ہوں۔ افسوس ہی کہ اس کے معافی پر بیشتر سے غور کر کے ان حوادث کے لیے تیار نہ تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ کا مطلب یہ ہی کہ میں بھی خدا کے لیے اور لڑکا بھی خدا کے لیے ہیں سمجھتا تھا کہ لڑکا میرے لیے ہے، اکبر کے حسب حال میرا ایک شعر ہی ہے

اب وہ سمجھا جس کو پہلے مونٹوں سے بظاہر کہتا تھا

میں اس افتاد سے پہلے بھی اللہ کو قادر کہتا تھا

آخر میں اکبر خود اس راز سے باخبر ہو کر کہتے ہیں

حسن آغاز تو رکھتا ہی یہ عیش دینا مگر افسوس یہ ہی خوبی انجام نہیں

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا جو بُت تھا نگاہ پر چڑھتا تھا

انجام یہ ہی کہ مر رہے ہیں اللہ اللہ کر رہے ہیں۔

اب تو ہی یہ سوچ کیا میں کیا نشاطِ زندگی

ہو چکا دو دن کا دورِ انبساطِ زندگی

دیکھے انجام کیا ہو، ڈر رہا ہوں سوچ کر

لذتِ دنیا سے ایسا اختلاطِ زندگی

پھر فرماتے ہیں ۛ
 سنور تے تھے کہ ایک عالم کی نظریں ہم کو دیکھیں گی
 خبر کیا تھی ہماری مجلس ماتم کو دیکھیں گی
 جب اپنے آپ حقیقت سے مطلع ہو گئے تو دوسروں کو بھی
 آگاہ کرتے ہیں ۛ

داستانِ غم نہ حالاتِ الم کو دیکھیے
 آپ کو آنسو بہانا ہیں تو ہم کو دیکھیے

باب دوم

مجھ سے مراسم اور خطوط

”میں ہوں دیوانہ مجھے اس ہی دیوانوں سے“

مجھے بچپن ہی سے دوا دین دیکھنے اور اشعار سُنانے کا شوق رہا ہے۔ سید اکبر حسین صاحب کے اشعار دیکھتا تھا تو دل میں بے اختیار اُن سے ملنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ دماغ اُن کی صورت، حیثیت، فیشن، اور جماعت وغیرہ کے خیالی نقشے تیار کرتا رہتا تھا۔ جب ۱۹۱۶ء میں الہ آباد کے ایم۔ سی کالج میں داخلے کے واسطے آیا تو یہ اشتیاقی دیوار پورا ہوا۔ ایک صحبت میں خان بہادر میر اکبر حسین صاحب نج الہ آبادی کے درشن ہوئے مگر ایسے کہ ع

آنکھیں اپنی باقی اُن کا

کسی کے متعلق کسی کا قیاسی خاکہ شاید ہی ایسا غلط ثابت ہوا ہوگا جیسا میرا وہ ذہنی نقشہ ہوا جو میں نے اکبر کے متعلق قائم کر رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ از سر تا پا تمام خیال الٹ پلٹ ہو گیا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ اکبر ایک خوش پوش بھاری بھرکم منڈی ڈاڑھی اور وجہ صورت کے نج ہوں گے۔ دیکھا تو ایک کمزور، نحیف، سوکھی گردن، چھوٹے سر، دبے ہوئے سینے فلرڈ چہرے اور کچھا ڈاڑھی کے ایک صاحب ایک خانہ ساز چوگوشہ ٹوپی لگائے کرسی پر خمیدہ پشت بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اکبر الہ آبادی ہی

ہیں - ع

ایر با آرزو کہ خاک شدہ

والد صاحب قبلہ کی تبدیلی کے باعث میں نے کالج کی ایف اے کلاس میں کچھ دیر سے نام لگھایا تھا کچھ میرے مکان سے اکبر کے مکان کی دوری (میں کٹرے میں رہتا تھا اور وہ شہر میں) کچھ خواندگی کے بار کے باعث میں تقریباً ایک سال تک اکبر کے پاس جانے آنے کا سلسلہ باقی نہ رکھ سکا۔ پہلی مرتبہ عشرت منزل جا کر میں ان سے اپنے ایک ہم عشا مولوی لائق علی صاحب کے ساتھ ملا جو خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب رئیس بریلواں کے فرزند ہیں۔ سید اکبر حسین صاحب سفید پا جامہ، مل کا گرتہ اور ایک شکستہ فل سلیر پہنے ایک آرام کرسی پر لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ سیدھے ہاتھ کی جانب ایک اگال دان رکھا ہوا تھا، اس میں بار بار تھوکے جا رہے تھے۔ لائق علی صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ آنکھوں پر سے چشمہ ہٹا کر مجھے دکھایا پوچھا: اس سے قبل آپ کبھی مجھ سے ملے ہیں؟ میں نے کہا: کبھی نہیں۔ میری نشان دہی پر فرمانے لگے: میں آپ کے تانا مولوی ابوالحسن صاحب بی۔ اے علیگ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ یہاں ہائی کورٹ میں مترجم رہ چکے ہیں۔ لائق علی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: لیکن میاں، تمہارے کالج اور پڑھائی کے کیا حالات ہیں۔ انہوں نے حالات بیان کیے۔ اس دن کچھ زیادہ کھلے نہیں اور نہ کچھ کلام سنا یا۔ واپسی پر لائق علی صاحب کہنے لگے، میں ان سے گفتگو کرتے ڈرتا ہوں کہ کس وقت کون سی بات پڑائیں اور پھبتی کس دیں۔ کہنے لگے ایک دن ایک صاحب جو سید صاحب

کے دُور کے عزیزوں میں تھے، تشریف لائے۔ شبِ برات کا موقع تھا، انھوں نے پوچھا آج کدھر بھول پڑے۔ انھوں نے کہا آپ سے شبِ برات کا تحفہ لینے آیا ہوں۔ یہ سُن کر سکوت کیا اور فرمایا سہ

تحفہ شبِ برات کیا تمھیں دوں

جان من تم تو خود پٹا حنا ہو

اس کے بعد سے جب میں شہر جاتا تھا، سید صاحب سے ضرور ملتا تھا۔ عشرتِ منزل میں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ سید صاحب شام کو اُس میں بیٹھا کرتے تھے۔ نمازِ باجماعت کا وہیں انتظام ہوتا تھا۔ آخر زمانے میں نمازِ جمعہ کو جامع مسجد جانا چھوڑ دیا تھا۔ سیڑھیوں پر نہ چڑھ سکتے کا عذر پیش کرتے تھے۔ مولانا محمد کافی صاحب کے وعظ میں بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ میرے ذوقِ سخن سے واقف ہو کر میرے عشرتِ منزل پہنچتے ہی اشار سنایا کرتے تھے کبھی زبانی، کبھی بیاض دیکھ کر۔ بیان اگر باہر میسر نہ ہوتی تھی تو اندر سے منگوائی جاتی تھی اور بتاتے رہتے تھے کہ کون سے اشعار کس پر کن حالات میں کہے ہیں۔ مگر یہ تاکید بار بار کرتے رہتے تھے کہ میری زندگی میں ان باتوں کو شائع نہ کرنا۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا مجھ کو عزیز تر سمجھنے لگے۔ وقتاً فوقتاً بتاتے رہتے تھے کہ خاص خاص مجبوریوں کے باعث مجھے خاص خاص مصطلحات ایجاد کرنی پڑیں مثلاً سرسید کا نام نہیں لانا چاہا تو پیر طریقت پیر نیچر، جناتِ گول کا بوڑھا۔ تہذیبِ نو کا چنداموں، نیچری خلیفہ کہہ کر ذہن کو ان کی طرف منتقل کرنا پڑا۔ مثلاً

کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹم ٹم پر یہی منزل ہے جس میں شیخ کاٹو نہیں چلنا

دیوانہ تھی قوم عشق میں پروں کے بکڑی گئی اور غلامِ چّات بنی

تہذیب نو کے رنگ پہ پبل بنے ہیں واللہ کیا بہار ہے اس سبِ باغ پر

گتا جیسے بہ فکرِ جیفہ دوڑے یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے
کہیں محبت سے حکومت مراد لی گئی ہے

قوائے کفر دنیا واعظ کی بے حسّی ہے

یہ عشق بت نہیں ہے اکبر کی پالسی ہے

کہیں محض ضارّ و اشارات سے افرادِ اعمال حکومت کی طرف خیال چٹا
کیا ہے

مسلم نکایت با خدا کر کہ تفسیرش (سرسید) با دیدی چاکر

سینہ میرا ہے دل نہیں میرا میری نہیں بات گوزباں میری ہے

چھوڑ کر رنج اپنے مٹنے کا منتظر ہوں اب ان سے پٹنے کا
اسی طعّ گنو ماما اور دھوتی سے ہندو قوم لالہ سے گماندھی ہر سے
سر سنہا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے غ

خدا ہی ہے جو ان کے سینگ سے بچ جائیں بقر عیدی
منا ہے آچلی ہیں اب گنو ماما بھی مستی پر

دھوتی دنگی بہت تنگ آئی تھی چلوں غ اب ہاں چلوں ڈھیلی ہے اسی مضمون سے

یوں تو ہیں جتنے شکوے سب کو فکرِ باغ ہو
یہ مگر سیج ہو کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہو

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا
چاند خاں کہہ کر مولوی نظام الدین صاحب کی ذاتِ مُراد لی گئی جنہوں
نے قری ماہ و سال کے بارے میں علمائے فرنگی محل سے ایک بحث
چھیڑ دی تھی۔ اس بحث سے پہلے اخباروں میں دل چسپی کا مسئلہ
آفتاب احمد خاں کی شخصیت اور سلم انجوشنل کانفرنس بنی ہوئی تھی۔ اُن
کے انگلستان جانے پر اخباروں کو مولوی نظام الدین حسین صاحب
کی وجہ سے چاند کا مبحث مل گیا۔ اُس پر کم دیا ع۔ غ
آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

غرض کہ یہ لطیف کنایات و نکات سمجھانے کے علاوہ اپنے
خانگی افکار، بنی جھگڑے اور مخفی خیالات سناتے رہتے تھے اور اپنا
دل ہلکا کرتے رہتے تھے۔ آخر عمر میں لوگوں کی تواضع اور مدارات
کرنے سے جان چرانے لگے تھے لیکن اس خصوص میں باوجود کافی
مخاط ہونے کے میری تواضع کرتے رہتے تھے۔ میں بھی اُن کی
مزاج داری، راز داری اور راحت رسانی میں حتی الوسع کمی نہیں
کرتا تھا۔ اگر کھانے میں شریک ہونے کے واسطے نہایت اصرار و ضد
سے کہتے تھے تو بیٹھ جاتا تھا کہ زیادہ اٹکار سے خفا نہ ہوں۔ مجھے اُن
کا یہ کلمہ بہت پیارا معلوم ہوتا تھا کہ ”آپ خوش خور نہیں“ اور
چاہتا تھا کہ اُن کی زبان سے بار بار اس کا اعادہ ہوتا رہے۔

ازبال پر غبارِ تنہا نشاندہ ایم بر شاخِ گل گراں نبود آشیان ما

بات بات میں لطائفِ منہ سے نکلتے تھے۔ افسوس ہو کہ ۱۹۱۹ء سے قبل مجھے ان جو اسرات کے جمع کرنے کی فکر نہ ہوئی۔ اس سال مجھے خیال پیدا ہوا کہ ان کی سوانحِ عمری لکھوں۔ اُس کے بعد سے اُن سے اور اُن کے احباب سے دریافت کر کے مواد جمع کرتا رہا۔ یہ یادداشتیں ایک زمانے تک غیر مرتب حالت میں پڑی رہیں۔ جب حالات نے کچھ موقع دیا تو اُن کو ترتیب سے جایا۔ بعض یادداشتوں میں تاریخ کا تعین نہ ہو سکا، ان کو بغیر تاریخ کے تعین کے رکھنا پڑا ایسی یادداشتیں ڈائری کے اوراق کے باب میں ابتدا میں درج کر دی ہیں ان یادداشتوں کی طرح ان خطوط کو بھی مہذب و محفوظ کرتا رہا جو سید صاحب کبھی کبھی مجھے لکھتے رہتے تھے۔ متعدد خطوط لوکل ہیں جو شہر سے کٹرہ ڈاک کے ذریعے بھیجے گئے ہیں۔ بعض محض اطلاعی ہیں جیسے پوسٹ کارڈ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۹ء ”خواجہ حسن نظامی صاحب آج تشریف لائے ہیں غالباً دو چار روز رہیں اطلافاً لکھتا ہوں“ اگر میں ایک دو ہفتہ عشرت منزل نہیں جاتا تو لوکل خط کے ذریعے توجہ دلاتے رہتے تھے ایک مرتبہ میں سائیکل سے گر گیا، ٹانگ میں جوٹ آئی۔ دس بارہ دن تک عشرت منزل نہ جاسکا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء کو لوکل پوسٹ کے ذریعے ایک کارڈ وصول ہوا اس میں لکھا تھا ”ڈیر سر، کئی دن سے آپ نہیں ملے۔ خدا کرے بائیکل بخیریت ہو، اُسی کی تقویت پر یہ شکایت ہو“ پوسٹ کارڈ پا کر میں عشرت منزل گیا اور عرض کیا کہ میں شاکرتا تھا کہ شعرا الہامی بائیں کرتے ہیں، آپ کی قوتِ متخیلہ نے تو اس کا ثبوت دے دیا۔

فرمایا: ”کیسے ہیں نہیں سمجھا میں نے کہا آپ نے میری عدم حاضری پر ہائیکل کی خیریت پوچھی، واقعی نہ ہائیکل ٹھیک تھی اور نہ میں۔ میں ہائیکل سے گر گیا تھا، ایک ہفتہ تک ٹانگ کی چوٹ نے چلنے سے معذور رکھا۔ انوس کر کے فرمایا: ”بڑا ہوا، اجی مجھے خواہ کوئی قدامت پسند کہے یا قدامت پرست، مجھے تو عہد حاضر کی اچھی سے اچھی ایجاد میں بھی مضرت کے پہلو نظر آتے ہیں خواہ وہ موٹر ہو، ہوائی جہاز ہو یا ہائیکل ہو۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو زرا غور کر کے فرمانے لگے اور ہائیکل تو دیکھیے مجسم روگ ہے۔ مرض بائی (Bi) سے شروع ہوتا ہے پھر سک (Sick) ہوتا ہے۔ پھر ال (Ill) ہوتا ہے یوں لفظ بائی سک ال (Bicycle) بنتا ہے۔ اسی طرح بات میں بات پیدا کرتے رہتے تھے۔ یہ لطیفہ آئندہ باب روزنامہ میں آئیں گے۔ پہلے خطوط نقل کرتا ہوں۔

۱۔ پوسٹ کارڈ عشرت منزل سے

الہ آباد، ۸ اکتوبر ۱۹۱۷ء

عزیز من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ آپ نے پھر میری خبر نہ لی میں ڈنکا ہوا بالآخر رے بی۔ لے نہ رہ جائے۔ اب اگر محنت تحریر گوارا ہو سکے تو انتخاب حصہ سوم کا وقت آگیا ہے۔ شب کو یہیں تشریف رکھے میں اگرچہ بہت ناتواں ہوں اور اکثر شکایتیں موجود ہیں لیکن پہلے کی نسبت اچھا ہوں۔ آپ والد صاحب سے میرا سلام فرما دیجیے۔
پتہ :- شہر الہ آباد، کٹرہ۔ مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظر عدالت دیوانی۔ عزیزی مولوی قمر الدین صاحب بی۔ لے کو پہنچے۔

۲۔ دہلی پرچہ عشرت منزل سے
 پانچ پیسے بھر کم سیر بھر مکھن پنپلہ
 Many thanks سیر بھر
 اور چاہیے، حکم دیجیے۔
 ۲۔ پوسٹ کارڈ

دہلی، درگاہ حضرت سلطان المشائخ، ڈاک خانہ عرب سرائے۔
 شفیق وہمہ درمن سلمہ اللہ تعالیٰ۔ کبھی کبھی عشرت منزل میں
 تشریف لے جائیے اور میری چھوٹی بہن یعنی اُس چھوٹی لڑکی کی جس
 کو آپ نے دیکھا ہی، دادی سے کہلا بھیجے کہ کچھ لکھوانا ہو تو میں
 لکھ دوں۔ انھوں نے ایک مرتبہ فسکایت کی تھی کہ ٹھیک لکھنے والا نہیں
 ملتا۔ میری فسکائیں بدستور ہیں۔ لیکن درگاہ شریف سے دل چپی
 ہے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔ اگر زندگی رہی اور یہاں رہا تو آپ
 کو کبھی بلاؤں گا۔ جو نقل کتاب آپ نے شروع کی تھی وہ کام یہاں
 ایک خوش عقیدہ نیک نوجوان نے کرنا شروع کیا ہے اگرچہ وہ نظر
 تحقیق کہاں ناظر صاحب کو تسلیم۔
 اکبر حسین

(تاریخ لکھنا بھول گئے مجھے یہ کارڈ الہ آباد میں ۷ نومبر ۱۹۱۹ء

کو ملا۔)

پتہ :- شہر الہ آباد محلہ کٹرہ، مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظر
 عدالت دیوانی۔ خدمت کرمی نشی قمر الدین صاحب بی۔ ۱۰ اے

دہلی تشریف لے گئے تھے تو مجھے فرما گئے تھے کہ پردف دیکھ کر
 بعد اصلاح میں اطلاع دے دیا کروں چنانچہ حصہ اول میں چند غلطیاں

کتابت کی معلوم ہوئیں، میں نے اطلاع دی۔ اس پر خط آیا:

۴ - پوسٹ کارڈ

دہلی، ۲۸ نومبر ۱۹۱۹ء

برادر عزیز۔ آپ نے ہر و کرم غلط لکھا، ہر کرم ٹھیک ہے یعنی آپ کے کرم کے آفتاب نے ہم کو چمکادیا اور ذرہ نوازی کی۔ ہر کے معنی آفتاب امید کہ فوراً اس اصلاح کو واپس لیجیے۔ آپ کی عنایتوں کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ اللہ جلد ملنے کی صورت نکالے۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ الہ آباد آؤں تو چند روز کٹرہ میں رہوں بشرطیکہ آپ لوگوں سے قریب جگہ ٹھہرنے کی ملے۔ گو کچھ خرچ بھی ہو مقبول احمد صاحب کا خط پہنچا، میری طرف سے بہت بہت سلام شوق کہہ دیجئے گا۔ خواجہ صاحب کی طرف سے دعا اکبر حسین

پتہ: الہ آباد کٹرہ جے سنگھ سوائی۔ مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظر عدالت دیوانی۔ غزنی مولوی قمر الدین صاحب بی۔ لے سلمہ اللہ تعالیٰ

۵ - ۲۸ نومبر ۱۹۱۹ء کو میں نے پروف حصہ اول دیکھ کر

خط لکھا تھا جو دوبارہ چھاپا جا رہا تھا۔ اس میں جہاں جہاں میرے خیالات سے اختلاف کیا تھا وہاں جوابی فقرے لکھ کر اسی خط کو واپس کر دیا۔ اسی حصہ اول کے ایک شعر

خن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو

بند کرے مگر آنکھیں اگر انسان میں ہو

کی نسبت میں نے لکھا ”انسان“ سے مطلب صاف نہیں ہوتا یہاں

انسان کی بجائے امکان تو نہیں ہے؛ اس پر لکھا: انسان ٹھیک ہے یعنی انسان کا حُسن نہ دیکھ۔ امکان بے معنی ہے۔ جملہ خوش نما اشیاء کیوں نہ دیکھیں دیوانہ تو انسان کا حُسن کرتا ہے اس لیے منع کیا۔

حقہ اول کے ایک دوسرے شعر کے بارے میں ۵

بے رونقی ابھن عشق نہ چاہی

خالی جوئی کوئی جگہ آہ بھراے

میں نے لکھا تھا کہ ”آہ بھراے“ کیا بات ہوئی اس کی بجائے ”اشک بھر آئے“ ہو گا۔ اس پر لکھا ”آہ ٹھیک ہے، اشک غلط ہے یعنی جو خالی جگہ کبھی اس جگہ آہ بھری“ آپ کا بہ دل ممنون ہوں۔ اگر زندہ رہا تو ملوں گا۔ میر صاحب کو مزاج پرسی کا خط آج لکھا ہے۔ اکبر۔ (میر صاحب سے چھوٹے بہنوئی مراد ہیں جن کی علالت کی اطلاع میں نے دی تھی)۔

۶۔ کارڈ عشرت منزل سے

الہ آباد ۲۲ دسمبر ۱۹۱۹ء

ڈیر قمر۔ سلمہ اللہ تعالیٰ۔ سردی بڑھی، دل گھبرایا۔ آپ کا فراق شاق تھا۔ کل اکسپریس میں ریزرو درجہ کر کے چلا آیا۔ صرف بے حد ہو، لیکن مجبوری تھی۔ امید کہ آپ خوش ہوں اور فوراً تشریف لائیں۔ اکبر حسین پتہ:- الہ آباد، کٹرہ جے سنگھ سوائی، مکان مولوی ضیاء الدین صاحب سنٹرل ناظر عدالت دیوانی۔ عزیز مولوی قمر الدین صاحب بی۔ اے

۷۔ کارڈ عشرت منزل سے

۴ جنوری ۱۹۲۰ء

تصحیح لکھی جا چکی تھی کہ دوسرا خط آگیا کہ ”شاید مضمون بھکار صاحب خفا ہو جائیں اس لیے تصحیح کو شائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ اب اس کو کٹوا دیا اور شائع نہیں کروں گا۔“

۹۔ ۲۴ اگست ۱۹۲۲ء کو خواجہ حسن نظامی صاحب کو میری نسبت لکھا ”آج صبح میں ایک گرجیوٹ بدلیونی سے کہہ رہا تھا کہ آپ کے مرید ہو کر سلسلہ نظامیہ میں داخل ہو جائیں اور کوشش و محنت سے خلافت حاصل کریں۔“ اس کا مفصل حال ڈائری میں درج ہے۔

۱۰۔ ۴ فروری ۱۹۲۱ء کو عشرت منزل سے ایک کارڈ کٹہ میں مولوی نور الحسن صاحب کو لکھا ”خواجہ حسن نظامی صاحب کل بدھ کو دوپہر کی ٹرین میں تشریف لائے والے ہیں۔ رات خط آیا۔ اطلاعاً عرض ہے۔ اگر پچھری کر کے آسکے تو بہتر ہے۔ میرا ملازم رخصت پر گیا ہے۔ کوئی خادم باسلیقہ موجود نہیں۔ علیل ہوں، تنہا ہوں، کارڈ اطلاعاً لکھ دیا۔ ممکن ہو تو قمر الدین صاحب کو خبر کر دیجیے۔“
اکبر حسین

۱۱۔ ۱۶ فروری کو ایک دوسرا کارڈ عشرت منزل سے مولوی نور الحسن صاحب کو لکھا۔

الہ آباد۔ ۱۶ فروری ۱۹۲۱ء صبح

ڈیر فرنیڈرات شاہ نظام الدین صاحب دیگر اڈیٹر نقاد اگرہ سے تشریف لائے ہیں۔ عزیزی قمر الدین صاحب کا ایڈرس مجھ کو معلوم نہیں۔ براہ مہربانی آپ ان کو مطلع فرمادیں کہ اگر ملنے کا شوق ہو تو تشریف لائیں۔ میں قبض اور درد سر کی ایسی میکلف میں مبتلا ہوں

جس کا بیان دشوار ہے۔ اللہ جلد نجات دے۔ اگر اچھا رہا تو ۱۹ فروری کو قوالی کا قصد ہے۔

۱۲۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو مولوی نور الرحمن صاحب کو عفت منزل سے کارڈ لکھا۔

۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء
الہ آباد، عشرت منزل
جناب من

مولوی قمر الدین صاحب سے فرمادیکھیے کہ جنت الفردوس جو آپ میری غیبت میں اٹھائے گئے تھے، باوجود وعدہ آپ نے واپس نہیں فرمائی۔ عشرت صاحب دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں کل واپس آیا۔ زندہ رہا تو ملنا ہوگا۔ قمر الدین صاحب کا ایڈریس معلوم نہیں۔ نجم الدین صاحب (میرا چھوٹا بھائی) حافظ حکیم نجم الدین، کو دعا۔
اکبر حسین

مولوی نور الرحمن صاحب نے اس کارڈ پر حسب ذیل عبارت لکھی اور مجھ کو بھیج دیا ”مرد آدمی پھر جسے نہ لی کہ زندہ رہا یا مر گیا۔ بھائی صاحب، کتاب عروض واپس کیجیے اور آئندہ سے توبہ کیجیے۔“ کچھ تو سید صاحب کے بے موجب الزام اور کچھ نور الرحمن صاحب کے بھڑکانے کے باعث دماغ میں آگ سی لگ گئی۔ غصہ میں سید صاحب کو حسب ذیل خط لکھ بھیجا۔

۱۳۔ ۲۲ مارچ ۱۹۲۱ء

مظہم و مکرم بندہ تسلیم
چودھری رحم علی صاحب کی اطلاع پر کہ خان بہادر صاحب نے

آپ کو یاد کیا ہے اور جنت الفردوس طلب فرمائی ہے میں جناب سے ۱۰ مارچ کو ملا تھا اور عرض کیا تھا کہ اسی عرض کی کتاب سے مجھے امتحان ایم۔ اے میں کچھ مدد لینا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ پرسوں میں پرتاب گڑھ جاؤ گا کل وہ کتاب حافظ نجم الدین صاحب کے ذریعے روانہ کر دیجیے۔ اتفاق سے دوسرے دن جمعہ تھا۔

مولانا محمد کافی صاحب کے مدرسے میں جہاں نجم الدین پڑھتا ہے چھٹی تھی۔ وہ چوک نہیں گیا۔ میری مصروفیت جناب کو معلوم تھی۔ ۱۶ کو دوبہر کو امتحان ختم ہوا۔ شام کو میں عشرت منزل پہنچا۔ پھانک کھلا تھا، آپ کا کمرہ بند تھا۔ مکان میں کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر ٹھہتا رہا کہ طفیل یا سلیمان کوئی آجائے تو اُس کو کتاب دے دوں اور آپ کی واپسی کی تاریخ دریافت کر دوں۔ مگر کوئی نہیں آیا جبموراً مع کتاب واپس آنا پڑا۔ سب رجسٹرار صاحب کو کئی روز سے بخار آ رہا ہے انھوں نے آپ کا ۱۸ مارچ کا آیا ہوا کارڈ کل بھیجا جس میں لکھا تھا کہ ”قرالین صاحب سے فرما دیجیے کہ جنت الفردوس جو آپ میری غیبت میں اٹھا لے گئے ہیں، باوجود وعدہ واپس نہیں کی“ مذکورہ بالا امور اور اتفاقات کی وجہ سے کتاب دو مہفتہ تک آپ سے علیحدہ رہی جو متواتر تلافیوں کی نوبت پہنچی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ امید ہے کہ آپ ازراہ شفقت بزرگانہ مجھے معاف فرما دیں گے۔ آئندہ میں آپ کے لیے ایسی پریشانی خالی کا باعث نہ ہوں گا۔ کتاب میوہ شیریں جو جناب نے دی تھی کہ پڑھ کر رپورٹ کرنا لیکن افسوس ہے کہ اب تک نہ پڑھ سکا، واپس کرنا ہوں۔ اس کے جواب میں دو گھنٹے بعد ہی حسب ذیل دستی خط آیا۔

۱۴- الہ آباد، ۲۲ مارچ ۱۹۲۱ء

عزیز من

آپ نے اتنا بڑا خط لکھ ڈالا اور یہ نہ لکھا کہ کب ملے گا۔ صرف میرے رپورٹ نہ بنیے۔ میرا خیال رکھیے۔ بیماری کے سبب سے آپ ایسے دوستوں کی ہمدردی اور مصاحبت کا بہت محتاج ہو گیا ہوں۔ کتاب اور قلم کے بارے میں ہم اور آپ دونوں معاف ہیں۔ کچھ ضرورت معذرت نہیں۔ اس اثنا میں بہت علیل رہا۔ چراغ سہری سمجھیے۔ آپ کی کامیابی کا خواہاں۔

اکبر

۱۵- ۵ اپریل کو مولوی وحید احمد صاحب نے مجھ کو ایک لفافہ خان بہادر صاحب کے توسط سے روانہ کیا جس میں نسخہ کلیات اکبر حصہ سوم کی نسبت جو میری تحریک کی بنا پر نقیب پریس بدایوں میں شائع ہوا لکھا کہ کلیات حسب مدعا چھپ رہا ہے، وسط مئی میں انتشار لکھ تیار ہو جائے گا۔ خان بہادر صاحب نے اسی لفافے پر حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھے روانہ کر دیا۔

”بہ خط کل آیا۔ چونکہ آپ کی تشریف آوری کی امید جلد نہ تھی لہذا ڈاک میں بھیجوں گا۔ یا آنکہ عزیز منی محمد الدین مل جائیں۔ A.H. ۱۲۱۶“

۱۶- ۸ مئی ۱۹۲۱ء کو مجھے اور مولوی نور الحسن صاحب سب رجسٹرار کو کھانے پر دعوت دی۔ ہم دونوں بوجہ مجبوری وقت پر نہ پہنچ سکے تو ”خدا کے بندو“ سے خطاب کر کے نور الحسن کے نام خط بھیجا۔ ”بی نیدھانے بہت اہتمام سے دو چار ہانڈیاں پکیں اور بچ گئے، لیے بیٹھی ہیں، جھنجھلا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں بلاؤ مرعفر

تو ہی نہیں گوشت ترکاری بورانی کی بات ہی کیا ہے۔ لیکن دل میں کہ
رہا ہوں کہ ایسی وعدہ خلافی اور بے پروائی چہ معنی دارد قمرالدین
صاحب کو تسلیم
اکبر حسین الہ آباد

۱۷۔ کارڈ عشرت منزل سے

الہ آباد۔ ۵ ارمی سلسلہ
مکرمی زاد الطائفہ

بلکٹ بہت عمدہ ہیں آپ کی محبت و فیاضی کا کہاں تک شکر
ادا کروں۔ خداوند تعالیٰ شاد آباد رکھے۔ اب گرمی بہت ہے اور میری
طبیعت صبح نہیں۔ دو تین دن میں پرتاب گڑھ جانے کا ارادہ ہے،
عشرت بٹاتے ہیں۔ یہاں بہ سبب تنہائی کے پریشان بھی ہوں۔ آئندہ
مراسلت انشاء اللہ پرتاب گڑھ سے ہوگی۔ معلوم نہیں کالج میں کب سے
کب تک تعطیل رہے گی۔ جواب پرتاب گڑھ بھیجے۔ بنگلہ سید عشرت حسین
صاحب ڈپٹی کلکٹر۔
اکبر حسین

۱۸۔ کارڈ پرتاب گڑھ سے بدایوں

پرتاب گڑھ، بنگلہ سید عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر ۳ جون ۱۹۲۱ء
ڈیر قمر سلہ اللہ تعالیٰ۔ سوال میں آپ کے خط نے عید کے چاند
کی خوشی پیدا کی۔ بیمار دنا تو اس میں تھا ہی۔ گرمی کی شدت نے اور بھی
بے حواس رکھا۔ بالکل بھولا ہوا تھا کہ آپ ایسا ایک انیس دنگار موجود
ہے۔ رات کچھ ترشح ہوا۔ آپ کے خط سے بھی مسرت ہوئی۔ کیا ناظر خاصاً
نے رخصت لی ہے؟ علی گڑھ کب آئیں گے۔ میں اپنی نسبت ابھی کچھ نہیں
کہہ سکتا کہ کہاں مقام ہوگا۔ بہ کاف حالات دل مضطرب ہے، ماحول موافق

کی تلاش میں ہوں جب تشریف لائے تو مجھ کو اطلاع دیجئے گا۔ آپ کے دوست رحبڑار صاحب مسافر تین ماہ کی رخصت پر جاتے ہیں۔ اشعار بہت جمع ہو گئے ہیں آپ سے ملنا ہو تو انتخاب کی ٹھہری ہمارے دوست فلاسفر عبدالماجد صاحب لکھنؤی مجھ سے ملنے کو یہاں آنے والے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب، ارشوال کے بعد قصد کرنے والے ہیں۔ سیکاش آپ بھی موجود ہوں، دوچار دن لطف رہے۔ نہایت مسرت ہوئی کہ آپ نے روزے رکھے۔ طاعت الہی کی طرف توجہ ہے۔ کیوں نہ ہو کُل شئی يرجع الی اصلہ۔ عزیزی نجم الدین کا عقد مبارک ہو۔ وہ کب واپس آئیں گے۔ سلسلہ مراسلت قائم رکھیے۔ یہاں تو ۲۹ مئی کا چاند ہوا۔ الہ آباد اور لکھنؤ میں بھی۔ لیکن اکثر جگہ پنج شنبہ کو عید ہوئی کیوں کہ چاند نہیں دکھائی دیا۔ وحید احمد کو سلام۔ اکبر

۱۹۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو لٹریچر کی اسٹنٹ پرفیسر کی ضرورت چھپی۔ میں نے بھی ایک درخواست روانہ کی۔ اس سلسلہ میں میر صاحب نے مولوی الیاس برنی صاحب کو حسب ذیل سفارش و تقاریر خط لکھا۔

الہ آباد۔، ۱۹ جولائی ۱۹۲۱ء

عزیزی حبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ

میرے دوست منشی قمر الدین صاحب بی۔ اے رئیس بدایوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں نوکری کے لیے درخواست بھیجی ہے۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ نازی ہیں۔ ذوق سخن خوب رکھتے ہیں۔ ان کی کامیابی کے لیے آپ جو کچھ کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کیجئے۔ منو

ہوں گلا اور دوستوں سے بھی کہہ دیجیے گا۔ اپنی خیریت سے مطلع فرمائیے۔ مکرر یہ کہ ۲۲ جولائی کو انتخاب ہے۔ اُردو لٹریچر کی اسٹنٹ پروفیسری کی درخواست ہے لہذا ۲۲ جولائی سے پہلے تحریک ہونا چاہیے۔

آپ کا دعا گو

اکبر حسین

پتہ :- حضرت الیاس برنی، ترپ بازار، حیدر آباد (دکن)

۲۰۔ سید اکبر حسین صاحب سے کسی نے کہہ دیا کہ مولانا محمد علی حسنا جوہر آپ سے کبیدہ ہیں کہ آپ نے ان کے متعلق یہ شعر لکھا ہے غ

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں

گو خاکِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

یہ سن کر وحشت ہوئی۔ مولانا کو خود خط لکھنا خلاف مصلحت سمجھا۔ مجھ سے کہا آپ لکھ دیجئے اور اُن کا مشبہ دور کیجیے۔ میں نے حسب ارشاد مولانا صاحب کو یہ خط لکھا :-

الہ آباد، ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء

معظم و مکرم جناب مولانا صاحب قبلہ، تسلیم

اس مرتبہ آپ الہ آباد تشریف لائے تو میں یہاں موجود نہ تھا۔

ورنہ حاضر خدمت ہوتا۔ پرسوں میں نے سان العصر جناب اکبر حسین

صاحب سے سنا کہ اُن کے ”بدھو میاں“ والے شعر کی نسبت آپ کو

گمان ہے کہ آپ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ میں نے اُن سے دریافت

کیا۔ وہ افسوس کرتے ہیں کہ مولانا محمد علی صاحب کو میری طرف سے ایسا

گمان پیدا ہوا۔ فرماتے تھے کہ ان بھائیوں کی نسبت جو میری رائے ہے

وہ ان اشعار سے ظاہر ہو رہے
ایشیا نے کمر تو باندھی ہو کوئی شوکت ہو کوئی گاندھی ہو
مگر اب تک بہت سے ہیں اڑیل دیے ہیں شک ہو وہ ہی گاندھی ہو

دیگر

غ

دشوار ہو مستحق آنر ہونا

آساں نہیں علی برادر ہونا

فراتے تھے کہ بدھو والے شعر کی نسبت لوگ غلط خیالات پھیلا
رہے ہیں۔ اس طرف گاندھی جی کو سمجھاتے ہیں کہ تم پر اعتراض ہو اور
آندھی سے بربادی مراد ہے۔ یہ مقصود مرکز نہیں ہے۔ ہاتھ جی کے
متعلق یہ اشعار ان کی تعریف کے لیے کیا گم ہیں
مرچند بگولہ مضطر ہو ایک جوش تو اس کے اندر ہو
اک رقص تو ہو اک وجد تو ہے بے چین سہی برباد ہو

دیگر

آپ نے طاقت کی توجہ لائیاں دیکھیں بہت

ضعف کے ہیجان کا بھی اب تماشا دیکھیے

ضعف کے ہیجان سے مقادمت جھول (Passive resistance)
مراد ہو امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

نیاز کیش

قرالدین احمد

میں نے یہ خط ناگر روانہ کر دیا۔ تحریر کا یہ آخری کام تھا جو سید صاحب
نے مجھ سے لیا۔ جوہر کی خدمت میں یہ صفائی پیش کیے ہوئے دوپٹے

شکل سے گزرے تھے کہ فرشتہ اجل نے اکبر پر ہاتھ صاف کیا اور جج صاحب
صفائی کے لیے اُس عدالت اعلیٰ میں پہنچ گئے جہاں سے ع
کچھ کسی کی خبر نہیں آتی

میرا ایک قطعہ ہے
کچھ لوگ ساتھ لے گئے عبادات لائے ہیں اور کچھ سروں میں عشق کے سوئے سما رہے ہیں
یہ دیکھ کر کہ رحمت رب ہی خطا طلب ہم تو گناہ و شرم کا سرمایہ لائے ہیں
۲۱- خط وحید احمد صاحب اڈیر نقیب

بدایوں، ۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء

قمر صاحب - تسلیم

میں گویا گوشہ نشین ہوں اور دنیا سے بالکل علیحدہ۔ آپ کا خط
ابھی ملا۔ خط نہ تھا گولہ تھا۔ میں اس خبر جاں کاہ کو سن کر مبہوت ہو کر رہ گیا۔
مرنے سے تو انکار نہیں۔ مرنا تو ضروری ہی تھا مگر خان بہادر صاحب کی
ذات ایک دُرِ بے بہا تھی اور قوم کی رہبری و رہنمائی کے لیے بے مثل
فائدہ۔ اس وجود کی ابھی قوم و ملت کو بہت ضرورت تھی مگر خدا ہی
جانے کہ اُس کی اس میں کیا مصلحت ہے۔ یہ نقصان عظیم ہے اور قوم کی ہستی
میں رقی برابر شک نہیں۔ سید عشرت حسین صاحب کو تار اور خط ابھی
لکھ رہا ہوں۔ امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ پار سال غالباً اسی زمانے
میں آپ یہاں تھے۔ آپ کا وحید

۲۲- اکبر مرحوم کے انتقال کے بعد خواجہ حن نظامی صاحب نے
ایک مضمون میں اعلان کیا تھا کہ وہ سوانح عمری مرتب کرنے کے واسطے
الہ آباد آئیں گے۔ اس پر میں نے خواجہ صاحب کو ایک خط بھیجا، اُس

کا جواب آیا۔

دہلی، ۱۶ محرم الحرام ۱۳۲۰ھ

بھائی قمر الدین صاحب سلام علیکم

خط ملا۔ افسوس بدایوں کے بیڑوں سے محروم رہا۔ خیر آپ کی
دید مجھے سب کچھ ہے۔ حضرت اکبر میرے مولیٰ تھے۔ دنیا نے اُن
کو شاعر مانا، میں نے اُن کو کچھ اور جانا۔ پھر احسان کا کیا ذکر۔ اور دنیا
میں تو آدمی وہی ہے جو مرنے کے بعد کسی کا بنے۔ بنی کے تو سب
ساتھی ہیں۔ آپ سے تو بہت کام لینا ہے۔ اکتوبر کے لیے تیار رہیے۔
میں جبراً آپ کو اپنا بناؤں گا کہ آپ سب سے زیادہ مجھ کو وہاں
درکار ہیں۔

نیازمند

حسن نظامی

۲۳۔ ۱۰ اگست ۱۹۲۹ء کو خواجہ صاحب نے بدوران

قیام حیدر آباد ”منادی“ میں شائع کیا تھا ”مولانا قمر الدین احمد صاحب
بدایونی ہیڈ ماسٹر کاماریڈی حضرت اکبر الہ آبادی کے مخصوص اجاب
میں سے ہیں۔ اس واسطے وہ مجھ کو بہت عزیز ہیں۔ یہاں کئی
سال سے ملازمت کرتے ہیں۔ پہلے کاماریڈی سے خط بھیجا تھا۔
اب خود ملنے آئے۔“

خطوط اکبر شائع کرنے سے قبل خواجہ حسن نظامی صاحب

الہ آباد آئے تھے۔ مولوی نور الحق صاحب وغیرہ سے خطوط لے کر
اُن کو اپنے نام کے خطوط کے ساتھ اگست ۱۹۲۲ء میں شائع
کرا دیا۔ سوانح عمری کوئی مرتب نہ ہوئی۔ میں ابتدا ہی سے حیات اکبر

کھنے کے خیال سے مواد جمع کرتا آ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے نام کے خطوط خواجہ صاحب کو شائع کرنے کو نہیں دیے کہ اس علیحدہ سوانح عمری کے کام آئیں گے۔ جب سے کافی فرصت اور اطمینان کے انتظار میں اتنا زمانہ گزر گیا۔

لیک انگریزی مقولہ ہے: That which can be done
at any time is never done at all.

حیلہ جو طبیعت جس کام کو یہ کہہ کر ٹالتی رہتی ہے کہ جب چاہیں گے کر لیں گے وہ با اوقات کبھی نہیں ہوتا۔ آخر یہ تساہل کب تک ساگر بے علی کے بہی بل و ہمار ہیں تو حیاتِ قمر ختم ہو جائے گی اور حیاتِ اکبر وجود میں نہ آئے گی۔ اس خیال کے تحت میں اس سال گرما کی تعطیل میں جم کر بیٹھ گیا اور بزم کے منتشر نوٹ مرتب کر کے صاف کر ڈالے۔ غرض کہ یہ غنچہ مراد اتنے عرصے کے بعد اب اس قابل ہوا ہے کہ صاحبانِ ذوق کے مشام تک اپنی خوشبو پہنچائے۔

فردوسی شاہ نامے کے لیے بیس برس تک سوچا رہا کہ اس کو کس کے نام سے منسوب کیا جائے۔ کہتا ہوں
سخن را نگہ داشتہ سال بیت
کہ بینم سزاوارِ این گنج کیست

حالات کی عجیب یکسانیت ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک یعنی سال میں سال تک اس تالیف بزمِ اکبر کے متعلق میں یہ تصنیف نہ کر سکا کہ ”سزاوارِ این گنج کیست“ مگر ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے، کوئی امر وقت سے پہلے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ اب وقت

آیا تو اپنی بست سالہ سعی کے اس نتیجے کو اُردؤ کے میسٹراڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ اُن سے زیادہ کوئی اور اس کا مستحق نہیں ہے

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چنم من
کارے کہ کرد دیدہ من بے بصر نہ کرد

باب سوم

میری ڈائری کے اوراق

سید صاحب نے ایک دن دریافت فرمایا: مغرب ہماری کس چیز کا دشمن ہے؟ میں نے عرض کیا: مذہب کا۔ فرمایا: نہیں، اہل مغرب کے نزدیک مذہب خود کوئی قابل احترام شے نہیں ہے پھر اُن کی بلا سے آپ مسجد میں جان دیں یا گرجے میں مریں، البتہ زندگی بھر اُن کا پاٹ (پانخانہ) اٹھانے میں پس دیش نہ کریں۔ گرجا خود ان کے لیے ایک لطف نظر اور حظ نفس کا مرکز ہے۔ میں نے عرض کیا اہل مغرب ہماری دولت کے دشمن ہیں۔ فرمایا: ہاں، دولت کے دشمن کبھی تھے لیکن اب ہمارے پاس دولت رہی کہاں اور اُن کی دشمنی ہے کہ اب تک یہ پایاں نمی رسیدہ میں نے عرض کیا: آپ فرمائیے، میری سمجھ میں نہیں آیا فرمایا: اہل مغرب ہمارے اس تخیل کے دشمن ہیں کہ ”پریم سلطان بود“ ہم اب تک نہیں بھولے اور اس وجہ سے ہم کو مٹی میں لانے اور پست فطرت لوگوں کو ہم پر مسلط کرنے کے درپڑ ہیں۔ کہ یہ تصور ہمارے ذہنوں سے نکل جانے کہ ہم حاکم قوم Ruling nation کے افراد ہیں۔ اُن کو خوف بھی ہے کہ اگر اُن کی حکومتوں کے لیے کچھ مضر ثابت ہوگا تو مسلمانوں کا یہی جذبہ ہوگا کہ ”مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا“ دیکھو میں نے انھیں خیالات کے تحت یہ شعر کہا ہے

نہ ہیں دیں کے اور نہ ہیں دُشمن کے دشمن
نقطہ ہیں وہ اپنے میاں پن کے دشمن

اور مینے سے
آپ اکبر لاکھ مشق خوش کلامی کیجیے
کتنا ہی اظہارِ اعزازِ دوامی کیجیے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں شش و پنج
باکھیکے سامنے سے یا غلامی کیجیے

مولوی عبدالماجد صاحب دریا بادی آئے ہوئے تھے۔ سید صاحب اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے گھوڑا گاڑی میں کٹرے سے گزر رہے تھے۔ راستے میں مجھے سائیکل پر جاتے دیکھ کر گاڑی روکی اور مجھے مولوی عبدالماجد صاحب سے متعارف کیا۔ شام کو میں عشرت منزل پہنچا تو مولوی عبدالماجد صاحب کسی سے ملنے کو باہر گئے ہوئے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا: ہمارے فلاسفر صاحب اب تو ماشاء اللہ خدا کا منہ چڑھاتے چڑھاتے خدا والے ہونے والے ہیں۔ کہتے تھے کہ آج کل میں مولانا روم کی نمنوی پڑھ رہا ہوں کہ دیکھوں انھوں نے فلسفہ اور عرفان کی راہیں کیوں کر طے کی ہیں۔ یہ ایسا ہی سی جیسے کوئی پوچھے کیوں جی مجنوں کیسے روتا تھا۔ مخاطب کہے تم پوچھ کر کیا کرو گے؟ جواب ملے کہ میں بھی ویسے ہی رونے کی عادت ڈالوں گا۔ جہاں اس نقالی اور جذبہ خود نمائی سے کہیں دل میں اثر پیدا ہوتا ہے پہلے قلب میں مجنوں کا سا گداز پیدا کرو، اس کا سا رونا خود آجائے گا۔ مجنوں مجسم محبت تھا اور آپ مجسم نفرت۔ زعم فلسفہ دانی میں مذہب کے متعلق اپنے عقائد کا اعلان کر کے بیشتر اسلامی دنیا کو دشمن بنالیا۔ نفرت

سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے محبت تمام مسلمان متفر ہو گئے۔
 میں نے اسی کوفت میں یہ اشعار کہے ہیں ۔
 مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب

بدھو فلاشی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں
 خاک اڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل چاہی

مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں
 خدا کرے مولانا روم کی تعلیم اثر کرے اور الحاد سے ہٹ کر اسلام کی
 طرف آجائیں۔ دیکھو کیا اچھا شعر بھلا ہے ۔

مذہب میں پناہ آخر کو ملی اور کفر کی زد سے بچ نکلے

ہر دم سے یہی اب اپنی دُعا اللہ کا ہونا سچ نکلے

میں نے کہا: شر کی شوخی دیکھنے سے قابل ہے۔ جب خدا کے وجود ہی
 میں شک ہے تو دعا کس سے مانگی جا رہی ہے اس کے تیور آپ کے اس شعر
 سے ملتے ہیں ۔

منظور مجھے شکوہ بیدادِ مہاں ہے لہ تباد کوئی اللہ کہاں ہے
 فرمایا: ناقص تعلیم اور بُرا ماحول لوگوں کو الحاد کی طرف لیے جا رہا ہے
 نے اسی پر کہا ہے ۔

نئے ذی علم در اسکول روئے فنا و از جانبِ پیک بدتم

بدو گفتم کہ کفری یا بلائی کہ پیش اعتقادات تو بستم

مقتدا مسلم مقبول بودم دے یک عمر بالمحمد شستم

جالِ نیجری در من اثر کرد دگر نہ من ہاں شیخ کہ بستم

لے یہاں حضرت شیخ سعدی کے اس عام دِلے قطعہ کو اپنا بنایا ہے (دیکھیے صفحہ ۷۱)

میں نے عرض کیا کہ آپ نے اتحاد کی وجہ ناقص تعلیم درست فرمائی۔
 میرے ایک دوست حکیم محمد حسن صاحب کے چار مصرعے ہیں ۵
 دانش سے کہا آئی میرے دل میں جگر کیوں دہریے ہو جاتے ہیں علامہ دہر
 کہنے لگے اک کشتہ سیاب ہے علم بچا ہو تو اکسیر ہر کچا ہو تو زہر
 نان کو آپریشن کے تذکرے پر فرمایا دنیا ترقی کرے لیکن ہندوستان او
 باخصوص ہندستان کی ایسی رہائیں کسی طرح نہیں ابھرسکتیں۔ حکومت کا
 نظام کچھ ایسا ہے کہ حقیقی ترقی کی کسی طرف گنجائش ہی نہیں نظر نہیں آئی۔
 یہ ہماری سمجھ کی غلطی ہے کہ ہم دیگر ممالک کے افراد کی طرح خود کو آزاد

(نوٹ صفحہ ۷۲) جمال ہمنیں درمن اثر کرد

وگر نہ من ہاں خاکم کہ ہستم

سید صاحب نے اسی طرح متعدد فارسی اشعار کو اپنی ظرافت و مصلحت کا جامہ پہنا
 ہے۔ حضرت حافظ شیرازی کا قطعہ ہے ۵

میلے برگ گل خوش رنگ درختار داشت وندال برگ دنواہد نالہائے زار داشت
 گفتش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست؟ گفت مارا جلوہ بخشوق در این کار داشت
 حافظ کے اس قطعہ کو اکبر نے یوں بدلا ہے ۵

بابوئے ورد ہوتی ز زر سکندر تار داشت باوجودش نالہائے زار در اخبار داشت
 گفتش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست؟ گفت مارا خوف فیس و ٹیکس و این کار داشت
 بنگالی حضرات کی قلبی کیفیت کو کئی جگہ بے نقاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں - غ

تیغ زباں کی دیکھو ہر سو برہنگی ہے بابو کے حوصلے ہیں صاحب کی دل آگ ہے
 (دیکھیے صفحہ ۷۲)

اور ترقی کرنے کا اہل سمجھتے ہیں۔ ہندستان برطانیہ کے معدہ میں ہی اور
 دہلی ریاستیں تو اس معدہ میں قریب قریب مضم ہو چکی ہیں۔ پھر ہندستان
 کے افراد سے ترقی کی توقع ایک خیال ہی اور جنون۔ ہماری حالت اس
 دانے کی سی ہے جس کو کسی جانور نے کھالیا ہو اور معدے کے فعل مضم
 کے اثر کے بعد وہ پھر جانور کے گوہر کے ساتھ خارج ہو گیا ہو۔ دوبارہ
 خشک ہو کر بظاہر ایسا دانہ ایک گیہوں ہی معلوم ہوتا ہے مگر یہ ایسا گیہوں
 ہی جس سے قوتِ نموسلب ہو چکی ہے اگر اسے بویا جائے تو اُگے گا نہیں۔
 اسی طرح ہماری شکل بظاہر انسانوں کی سی ہے مگر ہم سے باطنی جوہر اور عمل
 (بقیہ صفحہ ۷۵)۔

بابو صاحب کا یہ ہر شکوہ افلاس بجا سچ تو کہتے ہیں کہ مچلی نہ سہی بھات تو ہو

قول بابو ہے کہ جب بل پیش ہو پیش حاکم بلبسلانا چاہیے

بابو صاحب نے کہا اک باغ ہی میرا کلام اس میں کیا خشک ہے مگر یہ باغ شالامار ہی
 ”شالامار“ پنجاب میں ایک مشہور باغ کا نام ہے۔ اور بنگالی بابو سالاکو شالا کہتے ہیں۔

ہمیں بھگوان کی کرپانے تو بابو بنایا ہے
 مگر یورپ کے شالا لوگ نے آٹو بنایا ہے

سید صاحب نے حضرت مولانا روم کے اس شعر پر یہ

رشتہ در گردنم انگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست
 اکبری روغن بون چڑھایا ہے
 رشتہ در گردنم انگندہ پیٹ می برد ہر جا کہ میزاست دلپیٹ

کے دولے مفقود ہو چکے ہیں۔ میں نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے کہ
 دانے کو ہی حق نشوونما اس سے تو نہیں انکار اکبر
 لیکن یہ بتاؤ تو مجھ کو وہ کھیت میں ہی یا پیٹ میں ہی
 فرمایا ۱۹۱۷ء کے قحط سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا تھا کہ
 سچ تو ہی گردوں سے راہ ہربانی کیوں ملے
 آگ جب یورپ میں برے سم کو پانی کیوں ملے

فرمایا . . . صاحب نے ایک پارسی لڑکی کو بیوی بنالیا۔ اس کے بعد یہ سوال
 پیدا ہوا کہ پارسی اہل کتاب میں شامل ہیں یا نہیں۔ یہ لڑکی اگر پارسی مذہب
 پر قائم رہے اور میں اسلام پر تو ایسے تعلقات زن و شوئی قائم رکھنے
 میں اعتراضات تو نہ ہوں گے یا یہ صورت ہونی چاہیے کہ اس کے دائرہ
 اسلام میں آ جانے کا اعلان کیا جائے۔ بہر حال ایک پارسی لڑکی سے
 مواصلت مستقل کی خواہش نے اب توجہات تلاش کیں انسان ایک فعل
 نفس کے تقاضے سے کر بیٹھتا ہے، پھر اس کے جواز کی دلیل اور تاویل مذہب
 و قانون میں تلاش کرتا ہے۔ اس خیال نے مجھ سے یہ شعر لکھوایا کہ غ
 پہلے ہوتی ہے حسرت زن پیدا پھر بعد اس کے ہی بحثِ نیشن پیدا

افسوس

کہاں ہم میں جماعت اور طاعت
 نہیں ہے کچھ شکایت لیڈروں کی
 فکرت ہو گئے سابق کے رشتے
 کہ جیسی روح ہے دیے فرشتے

اور سنو

ممبر لیگ صفت مسجد مراد کا رنیت
 مفتی شرع نہ ہوں لیڈر اسلام تو ہیں
 جان بیمہ ہو چکا ہے حاجتِ غم خواریت
 بوئے مسجد نہ سہی گیمپ کے گلفام تو ہیں

فرمایا ایک دن ایک مسلمان گرجوٹ تشریف لائے۔ ان کی لیت تاریخی واقفیت اور گفتگو سے بہت جی خوش ہوا۔ اتنے میں حافظ صاحب نے مغرب کی اذان دی۔ اذان سنتے ہی یہ صاحب بولے: اب میں اجازت چاہتا ہوں، سب لوگ مصلے کی طرف بڑھے اور وہ صاحب دروازے کی طرف۔ میں حیرت میں رہ گیا کہ قال اور حال میں اتنا فرق ہے۔ میں نے اس پر کہا ہر سہ دل میں خاک اُڑتی ہے خالی بچہ دلب دیکھے

مذہب اب رخصت ہے میں تاریخ مذہب دیکھے
ایک دن حاضر ہوا تو بڑے غصے میں تھے۔ فرمایا آپ نے دیکھا میرے کلام پر بلایا کی ایک لڑکی خاتون اکرم کی طرف سے اعتراض شائع ہوئے ہیں کہ میری شاعری طبقہ نسوان کو قریبی عزت میں گرانے والی ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس لڑکی کے پردے میں کوئی مرد ہے۔ یہ مضمون لکھا کسی مرد نے ہے اور چھپوایا ہے ایک عورت کے نام سے۔ مردوں میں اتنی ہمت باقی نہ رہی کہ سامنے آکر مقابلہ کریں۔ ایک لڑکی کو رڈرڈ کر دیا ہے کہ تو بڑھ کے گالی کو سننے دے اسی خیال سے جل کر میں نے کہا ہر سہ

حمایت میں نے پردے کی توکی بھی خوش مزاجی سے

مجھے دلوار ہے ہیں گالیاں وہ اپنی باجی سے لے

لے ملاحظہ ہوں خطوط اکبر بنام خواجہ جن نظامی صاحب جن میں لکھا ہے ”مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اکرم و اصف جہاں کی تردید کرنے کو اکثر اخبار آمادہ ہو گئے ہیں۔ مگر میں اس کو فضول سمجھتا ہوں میں تو اصف جہاں صاحب سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں کہ جب تک آپ کا شباب ہے (بانی)

فرمایا: اسی طرح اڈیٹر تہذیب نسواں نے لکھ مارا کہ کاش اکبر کا قلم پردے کی مخالفت اور زمانے کے تقاضے کی موافقت میں اٹھا۔ میں نے اس کا جواب دیا ہے۔

اس بزم میں مجھے کہتے ہیں وہ موقع کے موافق بات کرو
اور سم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یاد دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں
فرمایا: ڈاکٹر اقبال نے تصوف اور حضرت حافظ شیرازی پر جو اعتراضات
کیے ہیں اُن سے مجھے رنج ہوا اور یہ شعر نکل گئے
مولوی ہو ہی چکے تھے نذرِ کالج اس سے قبل
خاتما ہیں رہ گئی تھیں اب ہر اُن کا انہدام
لکچر مضمون لکھتے ہیں تصوف کے خلاف

الوداع ای ذوقِ باطن الوداع ای فیضِ عام
اقبال کی یہ تحقیق کہ حافظ کی شراب عرفانِ حقیقت میں انگور اور ہوئے
کی شراب تھی، بذاتِ خود کسی معجونِ فلک سیر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے
بنیاد ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی
وہلکی سے ہو رہی ہے صفائیِ دماغ کی

فرمایا: بعض اہل ہند حکومت کے اشارے سے کچھ خیالات پیش کرتے ہیں اور
ظاہر کرتے ہیں کہ یہ خیالات اُن کے طبع زاد ہیں۔ میں ان لوگوں کو اس بلند خیالی
کی داد نہیں دیتا۔ میں اُن کے مغلیں کو مبارکباد دیتا ہوں
بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

ناچنے والے کو نہ دیکھو، یہ دیکھو کہ بچانے والے نے بچایا کیسا۔ افسوس ۛ

بے بصرہ ہیں جو حجت میں یہاں خرسند ہیں

جن کی آنکھیں کھل گئیں اُن کی زبانیں بند ہیں

فرمایا: میں نے اپنی آنکھ کا اپریشن کرایا تھا تو ڈاکٹر نے بٹی کھولنے کے بعد تاکید کر دی تھی کہ کوئی بات نہ کی جائے ورنہ آنکھیں متحرک و متاثر ہوں گی اس موقع پر یہ شعر کہا تھا۔ فرمایا مجھے سرسید اور شیخ عبداللہ صاحب بانی نوال کالج علی گڑھ کا خیال آیا اُس سلسلے میں یہ شعر نکل گئے۔

کالج بنا عمارت فخر النساء بنی شکر خدا کہ مل گئے آخر بابائی

اک پیر نے تہذیب لڑکے اُٹھا اک پیر نے تعلیم لڑکی کو سنو

وہ تن گیا تپلون میں یہ سایہ میں پھیلی پچاسہ غرض یہ ہر کہہ دو لوں آنا

میں نے عرض کیا اب تک میں آپ کے یہ اشعار مخرب اخلاق سمجھتا تھا ۛ

ٹرخا دیا ہر اک کو یورپ نے پاس کے بند بھئی کو لے کھسکے برسوں ماس کر کے

کاش کر لے مجھے وہ شاہد ہو مل منظور کیک تو روز ہر ایک رات تنجن بھی ہی

لیکن اس تپلون والے قطعے میں تو آپ بالکل عربانی پر اثر آئے۔ فرمایا: ہاں،

دنیا میں اس کی بھی ضرورت ہی جیسا مخاطب ہو اس سے ویسی ہی بات کرنی

چاہیے آپ میرا یہ شعر سنیں گے تو کیا کہیں گے ۛ غ

مجھی پر لکچر صاحب کی برقی وعظ گرتی ہی

بھرتے ہیں نقطہ فرہاد پر خسرو سے... تھی ہی

میں نے عرض کیا لاحول دلا قوت۔ آپ تو کھل کھل کر گالیاں بکنے لگے، بازاری

شہدوں کے واسطے کچھ تو زبان چھوڑیے۔ بگڑ کر فرمایا۔ اچھا اخلاقیات پر اپنا

وعظ ختم فرمائیے۔ میرے شعر کی قوت دیکھیے اور بس فرمایا بعض مقررین د

اجار موقع اور وقت نہیں دیکھتے۔ ببلک کی واہ واہ کے مغالطے میں بے گنا
زبان کھولتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے عرصے تک بھی خدمت نہیں
کرنے پاتے کہ ضمانت ضبط ہو جاتی ہے اور زبان بند کر دی جاتی ہے۔ میں
نے اس پر کہا ہے

دبیر میں وہ دوڑے بے تحاشا لگا ہونے ترقی کا تاشا
زباں گنجینہ لفظی میں لکھ لٹ جلی اسپنج کے میداں میں بگٹ
ہوئی جب جنوری رو کر ٹکی ٹاپ رہٹ لکھو اگیا قومی محاسب
فرمایا ۱۹۲۳ء میں الہلال کی ضمانت ضبط ہوئی اور اس کی زندگی ختم ہوئی
معلوم ہوئی تو کہا تھا

مغرب کی برق ٹوٹ بڑی اس غریب پر
دورِ فلک ہلال کو لایا صلیب پر
پرچہ ”توحید“ ضبط ہوا تھا، اس پر کہا تھا۔

ضبطی پرچہ ”توحید“ ہوئی فیسریہ،
قل ہوائے احد ضبط نہیں خیسریہ
اجار ہمد لکھنؤ کے بٹکنے پر کہا تھا

خوب ہے نام اس کا گر ہمد رہے
دم بٹکنے پر بھی باقی ہمد رہے
رسالہ نقیب بدایوں کے بٹکنے پر کہا تھا
نزعہ ہوا جو قلب پہ فوج رقیب کا
بکلا مقابلہ کو رسالہ نقیب کا

فرمایا: اس خیال کو کہ دسیوں کے مقابلے میں بدسیوں سے ساز باز

کرنا ملک کے لیے سخت مضر ہو، یوں ظاہر کیا ہو
 دُھن دیں کی تھی جس میں گانا تھا ایک دہاتی
 بکٹ سے ہو ملائم پوری ہو یا چپاتی

اونٹ (مسلمان) نے بگایوں (ہندو) کی ضد پر شیر کو ساھی کیا
 پھر تو میٹھ سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
 جس پر رکھا چاہتے ہو باقی اپنی دس ترس
 منہ میں ہاتھی کے کنبھی اری بھائی وہ گستاخ نہ دو
 فرمایا جب مشن صاحب کی بچی کے باعث لکھنؤ میں شیعہ کالج کی بنیاد
 پڑی تو ایک شیعہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ کالج علی گڑھ کالج کے
 مقابلے میں قائم کیا جا رہا ہے، سرسید کی درگاہ کو اس سے نقصان پہنچے گا۔
 میں نے اس پر ان سے کہا کہ سرسید کا مشن تو وسیع علم تھا۔ وہ غرض
 لکھنؤ میں اس کالج کے قیام سے اور پوری ہوگی۔ کالج میں مختلف علوم
 سکھائے جاتے ہیں، نرا مذہب نہیں سکھایا جاتا۔ خالص مذہب سکھانا امام
 بارہ کا کام ہے۔ اگر لکھنؤ میں کوئی نیا امام بارہ قائم ہوتا تو خیال ہوتا کہ
 سنی شیعہ لوگوں کے قلب کو ایک دوسرے سے بید کرنے میں ایک
 خلیج اور حائل ہوگی۔ اس لیے شیعہ کالج کے قیام سے سرسید یا ان
 کے گروہ کے لوگوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے اس پر کہا تھا کہ
 سید صاحب کو عذر کیوں ہونے لگا

کالج ہو یہ کچھ امام بارہ تو نہیں
 اگر کالج سے خالص امام بارہ کا کام لیا جانے والا ہو تو اس کی دوسری

بات ہو۔ فرمایا: اقبال کی ثنوی کا یورپ میں ترجمہ ہوا اور اس کی بہت داد دی گئی۔ خیال کرنے کی بات ہو کہ فارسی زبان ایشیائی فلسفہ اور عرفان اور اس کے یورپین قدردان، اس پر اقبال صاحب شاداں و فرحاں۔ اگر اہل ایران جو اہل زبان ہیں داد دیتے تو ایک امتیاز کی بات بھی تھی۔ میں اس یورپین ترجمہ اور داد کو ہرگز قابل افتخار نہیں سمجھتا۔ میں نے اسی پر کہا ہے

رقیب سرشکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم

یہی ہو عشق تو اب ترک عاشقی اڑے

فرمایا: انسان کی عزت کے متعلق اب دنیا کا معیار بالکل الٹا ہو گیا ہے

نہیں کچھ اس کی پرشش الفت اللہ کنتی ہو

یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہو

میں نے کہا: سچ فرماتے ہیں میرے ایک دوست نعمانی صاحب ایک سادہ

وضع مسلمان ہیں اور حیدر آباد میں گزٹڈ عہدہ دار۔ وہ ایک دن اپنی

بہتی بیان فرما رہے تھے۔ کہتے تھے ریل میں ایک صاحب اندر آنے میں

سخت مزاحم ہوئے، بہ دشواری میں ڈبے میں گھس کر کھڑا ہو گیا۔ ریل چلنے

لگی۔ معترض صاحب کے غصے کا پارہ اونچا ہو گیا کہنے لگے۔ آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں کہ جگہ نہیں ہے مگر جنگلی لوگ بھڑچال مخلوق گھسے چلے آ رہے

ہیں۔ کہاں تک جاؤ گے میں نے کہا حیدر آباد تک۔ یوے: ماشاء اللہ اتنا لمبا

سفر! اجی آپ کو جان دینے کو کوئی اور ڈبہ نہ تھا؟ میں نے نرمی سے کہا

کہ آپ کیوں اتنے برہم ہو رہے ہیں؟ میں آپ پر بار نہیں ہوں، ایک

کونے میں کھڑا ہوں۔ یہ سن کر بھر کچھ بڑبڑاتے رہے تھوڑی دیر بعد پھر

پوچھا: کیا حیدر آباد میں نوکر ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ پوچھا: کتنے کے؟ میں

نے کہا: آپ پوچھ کر کیا کریں گے ہضرت سے زیادہ مل جاتا ہے۔ بولے: کوئی تیس چالیس روپیہ ماہوار پاتے ہو گے؟ میں نے کہا: خدا اس سے زیادہ دیتا ہے۔ بولے: تو کیا ستر تا سو کے گریڈ میں ہو؟ میں نے کہا: اللہ کا احسان ہے کہ وہ آپ کی اور میری دونوں کی توقعات سے زیادہ دیتا ہے۔ بولے تو شاید آپ کو ڈیرھ سو تا دو سو کا گریڈ ملتا ہے۔ میں نے کہا: ہاں ابتدا میں یہی گریڈ تھا اب ترقی ہو گئی ہے بولے تو پھر یہ کیوں نہیں فرماتے کہ آپ دو سو سے اوپر کے گریڈ گریڈ میں ہیں۔ میں نے کہا: ہاں کہنے گے اس طرف دھوپ آرہی ہے، آپ میرے قریب اس سیٹ پر آجائیے۔ آپ سے اچھی ملاقات ہو گئی۔ میں نے سنا ہے حیدر آباد میں کوئی تعلیمی سند نہ رکھنے والوں کو ریلوے اور پولیس میں اب بھی اچھی نوکریاں مل جاتی ہیں۔ میرا ایک بھتیجا ہے، میٹرک میں کامیاب نہیں ہوا۔ اُس کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے اپنے شعری یہ وضاحت سن کر سید صاحب خوب ہنسے۔ فرمایا: اچی خود مجھ پر یہی گزری ہے۔ میں عشرت حسین کے پاس گیا۔ عشرت ڈپٹی کلکٹر ٹھہرے۔ شام کو دکلا، واجاب وغیرہ جمع ہو جاتے تھے۔ میں اندر سے بھل کر باہر آیا تو لوگ جمع تھے ان میں میرے ایک شناسا بھی تھے۔ انھوں نے چونک کر مجھ سے پوچھا: میر صاحب آپ کب آئے؟ میں نے جواب دیا۔ انھوں نے میرا تعارف موجودہ لوگوں سے کرایا کہ آپ خان بہادر سید اکبر حسین صاحب ہیں لوگوں نے لاپرواہی سے گزریں ہلائیں شناسا صاحب نے پھر کہا۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو ہیں اور جج رہ چکے ہیں، اب پنشن لے لی ہے جمع نے پھر ایک نمائشی مسرت کا اظہار کر کے کہا کہ بجا ہے بجا ہے۔ آخر میں میرے دوست نے کہا آپ

ڈپٹی عشرت حسین صاحب کے والد ہیں۔ اتنا سنا تھا کہ مجمع میں سے متعدد اصحاب آہا آہا کہتے ہوئے بے تحاشا دست بوسی کے لیے میری طرف بڑھے۔ اُن کے اس نظریے سے میرے دل پر چوٹ لگی مگر میں نے بھی گھن مارا۔ میں نے اپنے دوست سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائی میں نے آج عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ بلند مرتبت ریش دراز پادری جمع ہیں، عبادت و ریاضت کے آثار اُن کے چہرے سے ظاہر ہیں اُس مجمع میں ایک بزرگ تشریف لائے۔ تمام پادری صاحبان ایک استغرائی کیفیت میں تھے متوجہ نہ ہوئے۔ ایک صاحب نے توجہ کی اور پہچان کر دوسرے پادریوں سے کہا کہ آپ سے ملے خدائے قدوس آپ ہی ہیں۔ پادریوں نے بے پروائی سے گردنیں ہلائیں۔ متعارف کرنے والے نے پھر کہا۔ جی وقوم اور حافظ حقیقی آپ ہی کی ذات ہی۔ اس پر بھی پادری صاحبان متوجہ نہ ہوئے۔ آخر میں شام نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ آپ ہی ہیں تو مجمع جو تک پڑا اور خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑا۔ فرمایا زر کی قدر اور دیکھو

اکبر نے کہا سن لو یارو آئند نہیں تو کچھ بھی نہیں

یاروں نے کہا یہ قول غلط سخاہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

مگر زر کی طاقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میں خود کہتا ہوں

بے سود اشعار اور کبت ہوتے ہیں غفلت سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
کر بیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار یہ بہت نو بزر زر ہی چت ہوتے ہیں

میں نے عرض کیا: آنا شاعر قزلباش کا بھی یہی خیال ہے

آؤ اس بُت کو رُخ زرد دکھائیں شاعر نرم گردیتا ہی فولاد کو زر کا ٹکڑا

۱۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو عشرت منزل پہنچا سید صاحب کئی دن سے بیمار تھے،
جگر کی خرابی کی شکایت تھی غذا ہضم نہ ہونے کے باعث بہت ناتواں ہو گئے
تھے۔ میں نے مزاج پوچھا۔ فرمایا: ضعیف بہت ہو رہا

اگر کچھ زندگی باقی ہو اچھا ہو ہی جاؤں گا
وگرنہ جس طرح سب سو گئے ہیں سو ہی جاؤں گا

ضعیف پر خیال آیا۔ میر لقی فرماتے ہیں یہ
آہ جو ہمدی سی کرتی ہو آج وہ بھی کمی سی کرتی ہو
میں نے عرض کیا: میرے ماموں تولا حسین صاحب کا شعر ہو رہا
وہ آہ رات دن کی جو اک سہل بات تھی

اُس کام کو بھی ضعیف نے فکسل بنا دیا

۱۳ ستمبر ۱۹۱۹ء کو فرمایا: ایک صاحب نے جگر کے لیے اوٹنی کا دودھ
پینے کو بتایا ہو۔ آپ کو اگر کہیں مل سکے تو تلاش کیجیے۔ اس بڑھاپے میں
جگر کی خرابی پھر شیر خوار بنا رہی ہو، ماں باپ نے بچپن میں غلطی کی اگر کسی
دراز قامت اماں کا دودھ پلوا دیتے تو آج اوٹنی کی تلاش کیوں ہوتی۔
فرمایا: ڈاکٹر اقبال نے تصوف کے خلاف جو ہنگامہ برپا کر دیا ہو اس پر
میں نے کہا ہو رہا

تقلیدِ غرب و ترکِ عبادت پہ ہیں خموش
ے بیٹھے ہیں وہ صوفی خانہ خراب کو

افسوس

قرآن سمجھ لیں گے زرا پاس تو ہو لیں
دالتاس بھی دکھیں گے زرا اس تو ہو لیں

دیکھو کسی ایرانی نے کیا خوب کہا ہے
 نہ خیال حورو غلماں نہ سر بہشت مارا دلِ مافدائے دستے کہ جنیں سرشتِ ملاما
 ۱۴ ستمبر ۱۹۱۹ء -

فرمایا عشرت حسین کے لڑکے عقل نے آج بڑی ذہانت کا ثبوت
 دیا۔ میں نے ایک مصرع موزوں کیا تھا۔ غ
 ”مم ترک موالات کرد ریل نہ چھوڑو“
 اس پر اس نے کیا برجستہ مصرع لکھا یا ہے۔ میں نے کہا کیا فرمایا: وہ خود
 منائے گا۔ اُس نے سنایا۔ غ
 صاحب سے ہو بیزار مگر میل نہ چھوڑو

میں نے اس لڑکے کو پیار کیا اور ایک روپیہ انعام دیا۔ وہ
 لینے میں پس و پیش کرنے لگا۔ فرمایا لے لو یہ ہمارے مخصوص دوستوں میں
 سے ہیں۔ اُس نے لے لیا۔ اس واقعہ سے قبل کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ
 سید صاحب نے کسی مضمون کا ذکر کر کے لوگوں کو کوئی شعر سنانا چاہا لیکن
 اُن کے سوچنے سے قبل میں نے وہ شعر پڑھ دیا یا کسی نئے شعر کا
 دوسرا مصرع پڑھنے سے پہلے قافیہ بنا دیا اس پر میری تعریف کرتے تھے
 اور داد دیتے رہتے تھے کہ ماشاء اللہ آپ کا ذہن اور حافظہ کیسا تیز و
 لیکن عقل کو جب سے میں نے روپیہ دیا اُس کے بعد کئی مرتبہ لوگوں
 کے سامنے کہ چلے تھے ماشاء اللہ آپ نے خوب یاد رکھا۔ آپ کا ایک
 روپیہ انعام مجھ پر واجب ہوا۔ ایک دن سید مقبول احمد صاحب ستر
 دار کشنزی موجود تھے، اُن کے سامنے میری نشان دہی پر داد دیتے ہوئے
 فرمانے لگے کہ ماشاء اللہ ماشاء اللہ آپ کا ایک روپیہ انعام ہوا۔

مقبول احمد صاحب مجھ سے بعد کو دریافت کرنے لگے کہ کیا سید صاحب آپ کو داد نیشنل کیش دپا کرتے ہیں۔ میں نے کہا تو بہ کیجیے۔ اعلان نقدی سے وہ اپنے نزدیک میرا دل خوش کرتے ہیں مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے انھوں نے کہا ہر کس و نا کس کے سامنے ایسا اظہار اچھا نہیں ہے۔ اس کو کسی صورت سے بند کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کیا کروں۔ بولے اب اگر کہیں کہ آپ کا ایک روپیہ انعام ہوا تو سابقہ انعامات کا حساب سمجھا کر کہیے کہ اب تک میرے اتنے روپیہ یافتی ہیں۔ واقعی یہ نسخہ نہایت مجرب ثابت ہوا۔ میرے رقم مجموعی کے یاد دلانے کے بعد سے نقدی کے اعلان کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۱۹ء

فرمایا آپ نے ٹیکسیر کا کلام دیکھا ہے اس کا یہ مصرع یاد ہو گا:

Dust thou art, to dust returneth

اب میرا ایک مطلع مٹنے سے

باغ عالم میں نظر نمناک ہو کر رہ گئی

رنگ بدے خاک نے پھر خاک ہو کر رہ گئی

میں نے بہت داد دی۔ فرمایا دوسرا شعر سنو

جاتی ہے اسکول میں لڑکی تو کچھ حاصل کرے

کیا ہوا حاصل جو بس بے باک ہو کر رہ گئی

فرمایا: دیکھو کتنے شکل قوانی میں کیسا صاف شعر نکلا ہے۔ ہوم رولیوں اور حکومت

کے خیال کا فرق واضح کیا ہے

امید نے تو کھڑی کی ہیں خوب دیواریں زانہ کہنا ہے نہ چھت کبھی پٹے گی نہیں

فرمایا: یورپین سیاست میدان جنگ اور مکاتب دونوں سے یکساں مفید
مطلب کام لیتی ہو۔ اہل یورپ پہلے جنگ کے تمام خدائد پورے کر کے
زیر کرتے ہیں اُس کے بعد مفتوحہ ملک میں اپنے مدارس جاری کر کے قلوب
کو اپنے رنگ پر لاتے ہیں۔ اس خیال کو میں نے یوں ادا کیا ہے۔

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولہ ہٹا تو رنداہڑی
میں نے کہا دونوں مصرعوں کا وزن مختلف ہے۔ بولے: کیسے ہیں نے کہا
پہلے مصرع کی قطعیت یہ ہوگی ”فاعلاتن فعلاتن فعلمن“ دوسرے مصرع
کا وزن ہے ”فاعلاتن مفاعلمن فعلمن“

توپ کھسکی فاعلاتن پروفیسر فعلاتن پہنچے فعلمن
جب بسولہ فاعلاتن ہٹا تو رنداہڑی مفاعلمن داہڑی فعلمن

یا پہلے مصرعے میں پروفیسر کی بجائے پروفیسر کہنا پڑے گا جو غلط ہے۔ بولے
ماشاء اللہ ماشاء اللہ کیسی صحیح نظر پہنچی۔ درست کروں گا۔ فرمایا: ما خداے سخن
جناب نوح ناروی صاحب آئے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کو یہی شعر سنایا
تنبیہ کی ندرت پر واہ واہ، واہ واہ کرتے رہے اور اس عروضی سقم پر
نہ ٹوکا۔ میں تو پیرایہ سالی اور امراض سے ویسے ہی حواس باختہ ہوں۔ فرمایا
حصہ سوم کی ترتیب ۲۸ ستمبر سے شروع فرما دیجئے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۱۷ء

بتاریخ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۷ء مجھ کو ایک لوکل کارڈ کے ذریعے اطلاع
دی تھی یہ خواجہ حسن نظامی صاحب آج تشریف لارہے ہیں اطلاع لکھتا ہوں
شاید دو چار روز رہیں ”حسب اطلاع گیا مزاج پرسی کی۔ فرمایا یہ
ملہ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس مصرع کو درست کرنے کا خیال نہیں ہاں اس لیے کہ حصہ سوم میں وہی طرح چھپا

کمزور ہی میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی
زندہ جو رہا کچھ کر نہ کر سکا بیمار پڑا تو مر گیا

معلوم ہوا خواجہ صاحب تشریف نہیں لائے۔ میرے ساتھ مولوی محمد
صاحب صدیقی بی۔ اے (علیگ) بھی تھے جو اس زمانے میں حیدرآباد
اکاؤنٹنٹی سے الہ آباد میں کارآموزی کے واسطے روانہ کیے گئے تھے
اور اب فینانس میں مددگار ہیں۔ کچھ رسم الخط کا تذکرہ نکلا۔ مولوی
محمد محسن صاحب نے فرمایا کہ ہمارے ہاتھ کے جوڑوں کی فطری ساخت
ایسی ہے کہ تحریر دست چپ سے دست راست کی طرف لائیں تو جنبش
قلم میں تکلف نہیں ہوتا۔ سید اکبر حسین صاحب نے اس ریمارک پر فرمایا
اشارہ اللہ کیا کہنا اس پر ہم بھی صاد کرتے ہیں کہ انگریزی زبان پر تکلف
ہوتی ہے۔ جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے کے تذکرہ پر فرمایا: اچی ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ انگریزی ٹوکلوں سے جرمنی کو سکتہ ہو گیا ہے۔ انگریزی پالیسی اور
ترکیبوں کا کیا کہنا ہے غ

برخلاف انگلش کے یہ یورپ میں بکتا کون ہے
جس سے ہم ہائے ہیں اس سے جیت سکتا کون ہے
فرمایا: افغانستان پر گولہ باری کے سلسلے میں اس شعر کو میں نے اہل
افغانستان کی زبان سے ادا کیا ہے غ

ایر شپ سے ہم پناہ اور خج پائیں گے کہاں
آسماں بولا کہ ہم سے اڑنے جائیں گے کہاں

فرمایا ہے

جو ایر شپ پر چڑھے تو ایسے کہ بس یہیں ہیں خدا انہیں ہے

جو ایرشب سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہو
۱۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں نے حصہ سوم کی ترتیب ۲۸ ستمبر سے شروع کر دی تھی جب اس
شعر پر پہنچا ہے غ

خجھر کی چمک بھی چھپ نہ سکی فریاد بھی میری سب نے سنی
دامن نہ سمیٹ اب اے قاتل دکھاس میں اہو تو بھر بھی گیا
تو میں نے کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے بندش بھی بہت ڈھیلی ہے میرے ماموں
صاحب فرماتے ہیں یہ
اہو بھی رنگ میں اپنے گریباں کو چھپا بیٹھا

چھپا یا جب اہو سینے کے زخموں کا گریباں

پاس آئے تھے تو دامن کو بچائے رہے تم یہ سمجھے کہ سمجھ ٹھیک ہو دیوانوں کی
کسی اور کا شعر ہے یہ

کہیں الزام گستاخی نہ دو خون شہیداں کو

اہو مقتل میں بہتا ہے سمیٹو اپنے داماں کو

فرمایا: ہاں سچ ہے شعر کمزور ہے خارج کردہ اور یہ شعر حصہ سوم سے خارج
کر دیا گیا۔

فرمایا: اہل یورپ نے ہمیں سیاست میں اُلجھا کر مذہب سے بیگانہ
کر دیا۔ خود پر اعتراض کرنا اس لیے سکھایا کہ معترض کم از کم اتنی ہی دیر
کے لیے یا دِ خدا سے غافل ہو جائے۔ اس خیال کو میں نے یوں ادا
کیا ہے یہ

نئی ترکیب یہ شیطان کو سوجھی ہو اغوا کی
خدا کی حد کیجے ترک بس مجھ کو برا کیجے

فرمایا جو لوگ فرائض کو ترک کر کے غضب خداوندی سے نہیں ڈرتے اور
اولادِ رسول کے غم میں سال میں ایک مرتبہ رو لینا نجات کے لیے کافی
سمجھ لیتے ہیں اُن پر طعن کی ہر سہ غ

غم حسین میں رونا ثواب ہو لیکن خدا کے خوف سے رونا بھی کچھ گناہ
فرمایا: رسمی رونے اور ناز و انداز کے اظہار غم پر یوں جھگی لی ہر سہ غ
یہ نغز ایہ بچک یہ جہانوی ہو کس طریقہ میں

کہا سچ کہنے والے نے یہ مذہب بیگماتی ہو
میں نے عرض کیا: آپ کو کہنے کا بھی کیا ڈھنگ معلوم ہو۔ بظاہر کچھ نہیں کہتے
لیکن سب کچھ کہ گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا رسمی گریہ و بکا اور سینہ کو بی
پر اور اعتراض دیکھو سہ

غم سے عبرت کا نور حاصل ہو غم نہایت مجلیٰ دل ہو
غم سے مطلب وہ غم جو دل غ بنے نہ وہ جو رسم کا چراغ بنے
میں نے عرض کیا سید مرزا صاحب تفتق لکھنوی کا گریہ پُر خلوص دیکھیے،
فرماتے ہیں سہ

کور ہو جاؤں مگر عشق میں رونے کو نہ روک
ناصر دِل سے زیادہ نہیں پیاری آنکھیں

میر انیس مرحوم نے بھی رونے کا فلسفہ خوب بیان کیا ہو فرماتے ہیں سہ
رونے سے جو بہرہ مند ہوں گی آنکھیں خالق کو وہی پسند ہوں گی آنکھیں
ہر عین یقین کہ آنسوؤں کا عقدہ کھل جائے گا سب جو بند ہوں گی آنکھیں

فرمایا جو شیعہ محض قال کے شیعہ ہیں حال کے نہیں، اُن کی کمزوری
میں نے یوں طشت از بام کی ہر سے غ
یہ چاہیے کہ بزرگوں کے ہوصفات پرست

بنے ہو شوقِ جماعت میں صرف ذات پرست
اگرچہ ذکرِ شہادت پر جان دیتے ہیں

جو دیکھے تو ہیں آرام جو، حیات پرست
فرمایا: دیکھو تیرا کہنا اس ترکیب سے ترک کرنا ہوں سمجھانا ہوں کہ تمہارے
خیال میں جن لوگوں نے نشانے خدا و رسول کے خلاف اولادِ رسول کے
حقوق کا اٹلاف کیا ہے ان کی سزا جہنم ہے اگر خدا نے انہیں جہنم میں ڈالا ہے
تو تمہارا اُن کو دوزخ کے کنارے کھڑے ہو کر گالی گشتار کرنا بالکل ایک
احمقانہ اور لامبنی فعل ہے۔ ایسے بتلائے عذاب کو تمہاری گالی کیا تکلیف
پہنچا سکتی ہے۔ اور اگر غیر مستحق کو گالی دیتے ہو تو منظمہ اور عذاب خداوندی
کے لیے تیار رہو۔ اس مفہوم کو یوں ادا کرتا ہوں سے غ

اپنے سر زحمت بے سود یہ کیوں لیتے ہو

جو جہنم میں ہیں گالی انہیں کیوں جیتے ہو

فرمایا: بعض لوگوں کے نزدیک مذہب میں تیرا ایسا ہی ہے جیسے طب میں
پرہیز۔ میں نے یہ شعر تعزیر ہندی، علم اور تحت وغیرہ کے ناٹھی جلوس پر کہا
ہر سے غ

کارِ دین اور ہر مونا کی خرافات ہے اور

بد تمیزی جو کرے خلق تو وہ بات ہے اور

فرمایا۔ آپ نے مجھے ابک دن کہا کہ بڑھا تعزیر مکمل رہا ہے چل کر دیکھ لیجیے۔

گرمیں نے انکار کر دیا۔ مجھے ان جلوسوں کے ساتھ انتظامی پولیس کی مسلح جات دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام آج بھی فوج کی حراست میں جا رہے ہیں۔ ہائے - غ

پہلے سنتے تھے صدائیں مرد میدان کون ہے

اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گویاں کون ہے

فرمایا: آپ دُوری کے باعث یہاں زیادہ نہیں آسکتے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اپنے کٹرہ والے بنگلہ میں قیام اختیار کروں۔ میں نے عرض کیا میرے مکان سے وہ بھی ایسا قریب نہیں ہے۔ فرمایا پھر کیا کروں۔ اپنے مکان کے قریب کوئی کرایہ کا مکان تلاش کیجئے کہ آپ میرے پاس زیادہ سے زیادہ اُٹھ بیٹھ سکیں۔ فرمایا: حکیم اہل خاں صاحب کا خط آیا ہے کچھ غیر مطبوعہ کلام طلب کرتے ہیں، کچھ روانہ کر دیجئے۔ میں نے کہا آپ جو فرمائیں نقل کر دوں۔ فرمایا یہ غزل روانہ کر دیجئے

زباں بند ہے اس عہد پر نگاہ کے بعد سکوت ہی مجھے رہتا ہے اب تو آہ کے بعد
۲۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

سید راحت حسین صاحب چمبرا ضلع سارن کا ایک خط آیا۔ اس میں سید صاحب کی تعریفوں کے بعد استدعا کی گئی تھی کہ مرسلہ غزلیات کو صحیح فرمادیں۔ خط پڑھ کر جیسے نہ جیسے ہوئے۔ فرمایا: ان لوگوں نے مجھے بے کار سمجھ لیا ہے بھلا میرا قابو ہے کہ غزلیات کی اصلاح کرنے بیٹھوں۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا: دیکھو ایک شعر موزوں ہو گیا ہے غ
اب تو نقدی سے کوئی صاحب میرا جی خوش کریں
مُن چکا ہوں آفریں بھی مر جا بھی وا ہ بھی

اگر ان غزلوں کے ساتھ لفافے میں دس (دس) کا نوٹ لکھتا تو خیر کچھ دردِ سہری اُٹھاتا بھی۔ راحت حسین صاحب کو جواب لکھ دیا۔ سترہاں سال ہو مرتے مرتے بچا خدمت سے قاصر ہوں۔ جدر آباد سے جسٹس غازی الدین صاحب کے والد نواب عزیز جنگ کا دیوان آیا تھا۔ مجھے دکھایا۔ میں نے قیمت دریافت کی۔ فرمایا۔ اجی قیمت سے آتا تو میں کیوں لیتا۔ میرے پاس جو کتب یا رسائل آتے ہیں وہ مفت ہی آتے ہیں۔ میں کسی ایرانی کے اس شعر کا مصداق ہوں یہ

ہر مرغ کہ پرزد بتائے اسیری اول بشگوں کرد طوافِ قفس ما
میں نے عرض کیا۔ کیا خوب شعر ہے۔ اسیری کے متعلق یہ شعر بھی اچھا ہے۔
طارے نیست کہ یک رشتہ زما برپا نیست
صید یک مرغ نہ کردم ز کہن دایمہا

اصل یہ کہ فارسی زبان شعر گوئی کے لیے وضع ہوئی ہے، اردو نے سرت بھی جنم لے تو اس میں مطالب کا یہ تحمل پیدا نہیں ہو سکتا۔ مجھے متعدد اردو اشعار پسند آئے لیکن جب اس مضمون کے فارسی شعر نظر سے گزرے تو اردو اشعار نہ صرف کم وقعت ہو گئے بلکہ ان میں عیب نظر آنے لگا۔ وزیر کے کلام میں حاصل دیوان یہ غزل ہے۔

چلا ہوا دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اور اسی غزل میں حاصل غزل یہی مطلع ہے۔ ایک ایرانی نے بھی یہی کہا ہو کہ محبوب کی گلی کی خاک کا ایک ایک ذرہ آسمان کی طبع باعثِ آزار ہے۔ اس طرح لا تعداد آسمان بنائے ہیں۔ کہتا ہے۔

ہر غبارے کز سر کوئے تومی گردد بلند
 بہر آزار دل من آسانے می شود
 چند روز ہوئے امراؤ مرزا صاحب عشق لکھنوی نے افغان شہزادوں کے
 یہاں اپنا یہ شعر دادِ خاص کی امید میں سنایا ہے
 ضعف سے ہاتھ نہیں اٹھتے ہیں دیوانوں کے
 رو رہے ہیں کہ کریں چاک گریاں کیوں کر
 اتفاق سے میں خزانہ عامرہ میں ایک شعر فارسی کا اسی مضمون کا دیکھ چکا
 تھا عشق صاحب کے شعر پر دل سے داد نہ ملے ان کے استفسار پر میں
 نے کہا کہ ایک ایرانی کو بھی یہی موقع پیش آیا ہے۔ ضعف سے گریبان تک
 ہاتھ نہیں جاسکتا کہ جذبہ جامہ دری پورا ہو غضبناک۔ محبوب اس طرف
 سے گزرا، عاشق کو دیکھ کر ہاتھ مارا اور گریبان بھاڑتا ہوا لے گیا۔ کہنا ہوا
 رسید بار و گریبان من درید و گزشت
 بہ داد کو تہی دست من رسید و گزشت
 اس ایرانی کا کام بن گیا کہ نہ صرف جذبہ جامہ دری پورا ہوا بلکہ محبوب کا
 ہاتھ گلے تک پہنچا اور آپ ہیں کہ ”رو رہے کہ کریں چاک گریاں کیوں کر“
 عشق صاحب نے ”من“ کو اعتراف کیا اور کہا کہ ایرانیوں کی بلا دور، ہم سے
 یہ باتیں نہیں سدھر سکتیں امیر مینائی مرحوم کا یہ شعر ایک عرصے تک دلی پر
 چڑھا رہا ہے

ہائے وہ پھول سے گال اور وہ قد بوٹا سا
 وہ جہاں بیٹھتے ہیں باغ لگا دیتے ہیں
 لیکن جب فارسی کا یہ شعر دیکھا تو اس کی قدر کم ہو گئی ہے

تھوے چوسو دُڑے، بھو ارغواں داری
 مردوب باغ کہ درخانہ نکلتاں داری
 عزیز لکھنوی کے اس شعر سے دل کئی دن تک لذت اٹھاتا رہا ہے
 بدگماں کو میری میت پرگماں سکتے کا ہے
 حکم ہے آئینہ دکھلاؤ میری تصویر کا
 لیکن جب فارسی کا یہ شعر نظر سے گزرا ہے

زجم جاں برآمد بادت گرمیت جان من
 بیار آئینہ رخسار خود پیش دہان من

تو عزیز کے شعر میں کھلا ہوا عیب نظر آنے لگا اس ایرانی پر بھی یہی گزری
 ہے کہ مر گیا ہے۔ محبوب پاس کھڑا ہے لیکن اُسے بدگمانی ہے کہ عاشق مرا
 نہیں ہے۔ مومن خاں کی سی ترکیب چلتا ہے کہ ہے
 ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھے

جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

خود اپنے فائدے کے لیے نہیں محبوب کی خوشی کی خاطر کہتا ہے کہ میں تو
 مرجھا ہوں آپ کو یقین نہیں ہے تو میرے منہ کے سامنے اپنا آئینہ جیسا
 گال لاکر تحریک کر لیجیے، عزیز کا یہ کہنا کہ ”آئینہ دکھلاؤ میری تصویر کا“
 اب نفسیاتی حیثیت سے غلط معلوم ہوا۔ آئینہ دُور سے بھی دکھایا جا
 سکتا ہے لیکن ضرورت آئینے کے پیش دہاں لانے کی ہے۔ اگر نفس باقی ہے تو
 آئینے کی سطح پر بھاپ معلوم ہو جائے۔ یہ فارسی شعر ہر حیثیت سے مکمل
 ہے عاشق خود جنبش نہیں کر سکتا محبوب کے رخسار کو اس ترکیب سے قریب
 لاکر بوسہ کی ہوس مرے کے بعد بھی پوری کر لیتا ہے۔ آئینہ رخسار کہہ کر محبوب

کے حسن کی تعریف بھی کر جاتا ہے اور یہ بھی سچ کہتا ہے کہ اس کی جان جسم سے باہر ہے اس لیے کہ محبوب اس کی جان ہے اور وہ سامنے ہے حقیقت یہ ہے کہ بقول آپ کے - ع
ہر اک زباں کو یہ موتی نہیں عطا ہوتے

۲۳ اکتوبر ۱۹۱۹ء

مولوی رضا حسین صاحب میرنشی سے ملاقات کرنے گاڑی میں جا رہے تھے - میں ساتھ تھا - اُن دنوں میں حصہ سوم کی ترتیب و نقل کا کام کر رہا تھا - میں نے کہا آج میں نے الف کی تقطیع ختم کر دی - فرمایا: چلو ایک علت سے تو بیجا چھوٹا - مولوی رضا حسین صاحب کے یہاں سے واپسی پر رستہ میں کالون ہسپتال بڑا - میں نے کہا آج کل انفلوئنزا کے مریضوں سے تمام ہسپتال بھرا رہا ہے اس پر کچھ غور کیا اور فرمایا سنو -
غ انفلوئنزا سنا آیا ہے یہاں اسپین سے
ای خدا ہم کو تو تو محفوظ رکھ اس میں سے

میں نے عرض کیا اس شعر میں آورد نمایاں ہے اور دوسرے مصرع کی تو تو میں میں آپ کی شان کلام سے دُور ہے - فرمایا سچ کہا اسے بدلوں گا - پھر تھوڑی دیر کے غور کے بعد فرمایا -

انفلوئنزا چڑھا چوگان بازی اب کہاں

استبالی ہوئے ہیں استبازی اب کہاں

میں نے عرض کیا چوگان بازی کا زمانہ تو بہت عرصے پہلے ختم ہو چکا ہے -

اب اس پر افسوس کرنا بے محل ہو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسپتال کی رعایت سے اس تازی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فرمایا: پھر وہ اس زمین میں اور اچھے شعر نکل سکتے ہیں چنانچہ حسب ذیل دو شعر گاڑی میں کہے گئے۔
 اب تو بھیں بھیں کر لیا اور چل دیے گودم جن سے مسجد گونجتی تھی وہ نمازی اب کہاں
 اب سڑنی لے کی طلب تفسیر کا کس کو خیال فکرِ روزی ہو رہی ہے فرخِ رازی اب کہاں
 میں نے عرض کیا ان دونوں اشعار میں بھی آخری دونوں مصرعے چُست ہیں اور اول دونوں بودے۔ فرمایا نظر ثانی کروں گا (مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کو چُست اور درست نہ کر سکے اس لیے حصہ سوم میں ان کو درج نہیں کیا، چلتے چلتے شاید ہسپتال کے قتل سے کچھ خیال آیا۔
 فرمایا: معلوم ہے کہ ہماری سب سے بڑی نادان دشمن ہستی کون ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں معلوم۔ فرمایا: اتنا یہی محبت میں پیٹ بھرے ہونے پر بھی ٹھوٹھ ٹھوٹھ کر کھلاتی ہے اور بعض صورتوں میں تو ایسا بیمار ڈالتی ہے کہ امراضِ گور میں اُترنے سے قبل تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں مولوی غمّ الدین خاں صاحب ایل ٹی کے ہمراہ حاضر ہوا۔ نوٹ
 بک اندر سے منگوائی شعر سنایا۔

حواسِ ظاہری کے دام میں ادھام حاضر ہیں

مگر یہ صید خود صیاد اطمینانِ خاطر ہیں

میں نے عرض کیا اللہ اللہ شعر کیا ہے نفسیات پر ایک مبہوت رسالہ ہے ایسی ذہنی واردات کا انسان کو احساس تو ہوتا ہے لیکن مطالب کو پورے طور پر سمجھانے کے لیے ہر کس و ناکس کی زبان باری نہیں دیتی۔ آپ نے

کیسی دقیق بات کو کیسی پیش پا افتادہ تشبیہ سے کس آسانی کے ساتھ سمجھا دیا۔ انسان اپنی کم بینی سے سمجھتا ہے کہ خیالات کو میرے احساس نے گرفتار کیا ہے یہ میرے قیدی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی انسان خیالات کے ہاتھ میں خود ایک مجبور اور مضطرب کٹ پھلتی ہے۔

”آزما کہ عقل بیش غم روزگار بیش“

کسی ایرانی نے کیا خوب کہا ہے
 حصہ ہست کہ سرمایہ صد در دست فانی بال آن کہ از جہاں بے خبر است
 در بیضہ نمی کنند مرغاں فریاد ہر خند کہ بیضہ از قفس تنگ تراست
 اس خیال کو میرے ہم وطن چھٹی میاں نے بھی بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے
 مجبور ہوں معذور ہوں لاچار ہوں غم یہ بھی نہیں اگرچہ نادار ہوں میں
 اے خالق بے نیاز و نایہ ہر اس شدتِ احساس سے بیزار ہوں میں
 آپ نے اسی قسم کی لطیف قلبی واردات کو اس شعر میں بھی خوب زبان دی
 ہے اور انوکھی تشبیہ سے کام لیا ہے

لذت ہر روح کو تنِ خاکی سے میل میں
 فطرت نے مست رکھا ہے قیدی کو جیل میں

فرمایا: ماشاء اللہ آپ نے کیا قوی حافظہ اور کس قدر بلند مذاق سخن پایا ہے۔ کیا آپ کے خاندان میں متعدد شعرا ہوئے ہیں۔ میں نے کہا: ہاں، انھیال میں پڑانا مولوی شفاعت اللہ صاحب، ماموں تنہا حسین صاحب، اعلیٰ حسین صاحب اور تولا حسین صاحب یہ سب شاعر ہوئے ہیں۔ فرمایا: آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ میں نے کہا: میرا یہی ذوق میری شعر گوئی کے راستہ

میں حائل ہو۔ میں شعر کہتا ہوں مگر کہنے سے زیادہ مُنتہا اچھا ہوں جب خود شعر کہتا ہوں تو خیال مجھ سے کہتا ہو کہ اس مضمون کو عربی نے یوں ادا کیا ہو، مومن خاں یوں کہ گئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو یوں باندھ گئے ہیں اس کے بعد میری طبیعت میرے شعر کے بارے میں خود کہتی ہو کہ یہ کسی کو سننے کے قابل نہیں ہو۔ فرمایا آپ پختہ کلامی ابتدا میں چاہتے ہیں۔ آپ شعر کہتے رہیں تو یہ خود آجائے گی۔ شعر کہا کیجیے۔ حیات و ممات کے تذکرہ پر میں نے چلبست کا یہ شعر منایا ہے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا

قضا کیا ہو مخا ربِ بادہ ہستی اُتر جانا

حسبِ عادت اس شعر کی داد نہیں دی۔ فرمایا: دیکھیے، میں نے اس مضمون کو کیا کم قوت سے ادا کیا ہو۔

بھروسہ باغِ ہستی میں نہیں کچھ نخل قامت کا

نفس کیا ہو ہوا کی بیل ہو دھوکے کی ٹٹی پر

حصہ سوم کی ترتیب اور نقل کے سلسلے میں یہ شعر آیا ہو۔

دانتوں میں اُن کا ہونٹ دبایا تو بے وہ

دیکھو چڑھے ہیں حضرت عیسیٰ صلیب پر

میں نے کہا اس شعر کا مضمون رکبک اور بندش پورج ہو، قابلِ اخراج ہو

فرمایا اچھا آپ کی Recommendation (سفارش) منظور اور

یہ شعر دیوان سے خارج کر دیا۔

۵ نومبر ۱۹۱۹ء

کاغذات میں ایک خط لکھا۔ قبلہ ام دام ظلم۔ بعد ادا نے مرا م

کونٹھ عرض یہ ہے کہ کمترین کو اگرچہ حضور کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں بہت دنوں سے شوق میں بے تاب ہوں۔ مگر کیا کہوں کوئی صورت حضور سے ملنے کی نہیں نکلتی۔ خیر عرض یہ ہے کہ اپنا ایک مجموعہ مسمیٰ بہ نشر پاکس ارسال خدمت کرتا ہوں۔ امید کہ ازراہ کرم بہ نظر غور ایک ایک لفظ ملاحظہ فرمائیں گے کیوں کہ ہندوستان بھر میں حضور والا سے زیادہ کسی شاعر کی جودت طبع کا سنگہ میرے دل پر نہیں ہے۔ اگر حضور نے میرے رنگہ تغزل کو پسند فرمایا تو مجھے پوری داد مل گئی۔

امید کہ بشرط فرصت ریویو سے محروم نہ فرمائیں گے۔ یا کچھ بھی تشریح یاس کے متعلق رائے قائم کریں، اس کا اظہار کسی پرچہ میں ضرور فرمائیں کہ ملک کے اہل سخن بھی ملاحظہ کر لیں۔ زیادہ شوق قدم بوسی نیاز مند

مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی

ساکن حال لکھنؤ جھوائی ٹولہ

یکم جون ۱۹۱۲ء

فرمایا یاس صاحب نے لکھنؤ میں اگر معیاری پارٹی کو حیف کرنے کے واسطے غالب پر اعتراضات کا ایک لاتناہی سلسلہ شروع کر دیا ہے ان لوگوں نے بھی ان کو نیچا دکھانے میں کمی نہیں کی۔ ع

”تغو بر رخ یاس اینک تفو“

یاس کی طرح سے عزیز بھی میری ہمدردی حاصل کرنے کے خواہاں رہے۔ مجھ سے ہر دو سے خط و کتابت ہے یاس صاحب نے چراغ یاس میں مخالفین کو جواب دیتے ہوئے لکھ دیا ”میں نے بارہا اپنے کانوں سے سنا کہ مولانا اکبر الہ آبادی اور مولانا حاکمی پانی پتی اہل زبان نہیں ہیں۔

بھاڑ میں جائے ایسی جہالت۔ اگر مولانا اکبر اہل زبان نہیں ہیں تو کوئی اہل زبان نہیں؟ مختصر یہ کہ یاس صاحب نے مجھ کو غالب سے بڑھا دیا چاہا۔ لیکن ایک انگریزی مثل ہے کہ ”غیر مستحقہ توصیف حقیقت میں مضحکہ انگیزی ہو کر رہ جاتا ہے“

Praise undeserved is ridicule in disguise

میں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ عزیز صاحب نے غیر معمولی اخلاقی دباؤ ڈالے تو لکھ دیا تھا کہ عزیز صاحب لکھنؤ کے نامور شعراء میں سے ہیں۔ اہل ملک محل کردہ کو طلب فرما کر لطف اٹھائیں۔

عزیز صاحب کا یہ خیال مجھے پسند آیا۔ ع
”کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے“

سید صاحب سے اس گفتگو کے بعد راجہ پور الہ آباد میں ثاقب صاحب قزلباش لکھنؤ سے ملاقات ہوئی انھوں نے فرمایا کہ عزیز صاحب کے جس خیال کی داد دی جا رہی ہے وہ ابتداءً ۱۹۱۷ء میں میں نے ایک قطعہ میں ادا کیا ہے۔ بعد کو لکھنؤ سے ایک خط کے ساتھ وہ قطعہ بھی روانہ کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

وہ خدائے فن تھیں ان سے مجھ کو نسبت کچھ نہیں	جانشینی میر وغالب کی کہاں اور میں کہاں
مرثی ہے جس پر نیا اُس سے رغبت کچھ نہیں	خاطر غزلت نہیں ہے دشمن نام و نمود
واہ واکاغل ہو تو بھی فضیلت کچھ نہیں	چپ رہی مھل تو شان بے کمالی کیا گھٹی

اے یاس صاحب سے حال میں حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تو غالب کے خلاف مضامین کے متعلق انھوں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میں نے ان ایک ہزار رکعتوں کی نیت ضد میں باندھی ہے۔

اپنے لطف طبع کے باعث ہر شغل شاعری
آپخش ہوں سن کے اس کی بھی ضرورت نہیں
جو ہر قابل ہی جس کو مان لیں اہل مذاق
خود وحید عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں
۲۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء

فرمایا کل آپ کے چلے جانے کے بعد باوجود ریشہ کے میں نے
دو صفحے اور لکھے۔ ان اشعار کو بتائے خارج کروں یا رہنے دوں غ
صد شکر کہ اُس بت نے کیا آج بی لے پاس
اب اتنا ہی باقی ہے کہ ہو جائے میرے پاس
میں نے عرض کیا یہ شعر مضمون اور بندش ہر دو کے سحاط سے قابلِ اخراج
ہے۔ اتنا سن کر شعر قلم زد کر دیا۔ غ

محبوب ہے ہر قوم میں مذہب بھی ہے کیا چیز
آپ اس سے الگ ہو گئے مطلب بھی ہے کیا چیز
میں نے کہا اسے قائم رکھیے۔ فرمایا: نہیں، آپ نے دل سے نہیں کہا، اس میں
بھی ڈھیلا پن ہے یہ کہہ کر اُسے بھی خارج کر دیا۔ جب یہ شعر آیا غ
انعام اس سخن کا دس آج اور سو کل
اللہ ہر جگہ ہے اوتار و پیر لوکل

تو میں نے کہا ارے اس میں تو قافیہ نا درست ہے اقوا کا عیب ہے
حرف روی داد کے ماقبل حروف سین اور لام کی حرکت میں اختلاف
ہے۔ نیز دونوں مصرعوں کی روانی خراب ہے۔ قدم قدم پر طبیعت جھٹکا کھاتی
ہے۔ اتنا سن کر خفا ہو گئے اور فرمایا غ

قاعدوں میں جن معنی گم کر د
شعر میں کہتا ہوں بچے تم کر د

میں نے عرض کیا اس میں حن معنی بھی تو نہیں ہے دوسرے مصرعے کی خاطر جس میں کوئی خاص بات نہیں، آپ پہلا مصرع زبردستی لائے ہیں۔ نیز اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آج کیوں ناقدری ہے اور کل کیوں قدر ہوگی۔

بگڑے تیوروں کے ساتھ فرمایا: نہیں، روانی معنی سب ٹھیک ہیں۔ فیخ سعدی کی طرح سے مجھ کو بھی ”من گفتم و محاورہ شد“ کی سند حاصل ہے۔ جس شعر کو میں رواں اور ٹھیک سمجھوں وہ رواں اور ٹھیک ہی ہے۔ میں نے عرض کیا محسن کا کوردی انگریزی سے ناواقف تھے بہت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل ”دلے قصیدے میں انگریزی لفظ کاؤنسل Council کو غلط باندھ گئے۔“

اب میں دیکھ کے اڑتے ہوئے بگلوں کی قطار
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

اس پر اعتراض کیا گیا کہ آپ سین کو بالفتح نہیں کہہ سکتے انھوں نے جواب دیا کہ میں کب کہتا ہوں ”لوگ کہتے ہیں“ کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل۔ مراد یہ کہ کونسل کا سین بالفتح غلط العام ہے، اس لیے فصیح سمجھا جانا چاہیے۔ آپ کا لوکل غلط العام بھی نہیں ہے۔ فرمایا شعراء کو استحقاق ہے کہ انگریزی الفاظ کا تلفظ ضرورت شعری کے مدنظر تبدیل کر لیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر کوئی انگریز اپنی ضرورت یا سہولت کے مدنظر اردو الفاظ کے تلفظ کو بجا کر ادا کرتا ہے تو ہم کو بھی حق نہیں ہے اس کا مضحکہ اڑائیں کہ کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

یا یہ کہ۔ ع

یہ تم کس واسطے لکھا یہ تم کس واسطے بولا
 آپ نے ایک اور جگہ انگریزی لفظ Press (پریس) کو قافیہ کی خاطر
 کس کے وزن پر پرس کر دیا۔ یہی بہت بگڑ کر فرمایا: میں نے اہل لکھنؤ کو
 بھی اُن کے ایک اعتراض پر یہی جواب دیا تھا اور اب آپ کو بھی یہی
 جواب دیتا ہوں کہ

من گفتم و محاورہ شد
 اور بس۔ میں نے عرض کیا میں نے اپنی ایک عزیزہ کے سامنے اُن کے
 ایک گندے اور بدتمیز لڑکے کی شکایت کی۔ کہنے لگیں تجھیں معلوم نہیں کہ
 وہ مجھے اس قدر پیارا کیوں ہے۔ بات یہ ہے کہ اُس کا ذہن بہت تیز ہے۔
 مجھے اُن کے اس ارشاد میں بہت شک تھا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ اُن
 کی اولاد ہے بات نہیں بڑھائی۔ اس پر سید صاحب سخت برہم ہو کر کہنے
 لگے کہ اجی میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو میرا شعر خارج کرنے کا
 کیا حق ہے۔ میری طبع زاد اولاد نالائق بدتمیز جیسی کچھ ہے میرے لیے
 اچھی ہے۔ میں نے غیر معمولی برہمی دیکھی تو سکوت اختیار کیا اور وہ لوکل
 والا شعر حصہ سوم میں نقل کر دیا۔ اس کے بعد اُن کے اس شعر کا دل ہی
 دل میں مزا لیتا رہا ہے

کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوے رکا رہتا ہے کام
 تنگ ہے وہ شوخ مجھ تائیںخ داں مزدور سے
 سید صاحب نے اس دن اتنی محنت کی اور لوکل والا شعر حصہ سوم میں
 شریک کر لیا۔ لیکن بعد کو حصہ سوم چھپ کر آیا تو میں نے دیکھا یہ شعر
 اُس میں موجود نہ تھا۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء

فرمایا گورنر صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری مسٹر برنس کے سامنے کچھ آزادی کا ذکر نکلا۔ میں نے برنس صاحب سے کہا انسان کا یہ مغالطہ ہے کہ خود کو آزاد سمجھتا ہے۔ سانس لینا بھی ایک قسم کی مجبوری اور قید ہے۔ آدم زاد میں جب تک دم ہے آزاد نہیں ہو سکتا۔ آدم زاد سے دل اور میم یعنی دم نکالو تو آزاد رہ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا آدم زاد تو آدم زاد نباتات کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک سر نہ کٹے آزاد نہیں مثلاً Tree کے [] کا سر کاٹو تو [] ہو جاتا ہے۔ اب اس کو [] کے ساتھ ملاؤ تو [] ہو جاتا ہے جس کے معنی ہیں آزاد۔ سرسید کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے کافی غور نہیں کیا اور مغربی لیلا سے مشرقی مجنوں کو ملا دیا۔ نتیجہ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ نئی پود بے حیا بے ادب، فضول خرچ اور نمائش پسند ہو گئی۔ میں نے اسی پر کہا ہے

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ پڑھ کے بیٹے باپ کو خطی سمجھتے ہیں

گزر ان کا ہو کیوں کر حلقہ اللہ اکبر میں
بچے صاحب کے منجملہ پر مرے صاحب کے دفتر میں

۲۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء

بار بار پیشاب آنے کی شکایت تھی۔ باتیں کرتے کرتے میں نے پوچھا: اس وقت کیا وقت ہو گا؟ گھڑی کی طرف ہاتھ لے گئے اور گھڑی

ہاتھ میں لے کر ہاتھ روک لیا۔ فرمایا اس کے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے میں یوں ہی حساب کر کے بتا سکتا ہوں۔ میں نے عصر کی نماز ٹھیک ۴ ۱/۲ پر پڑھی تھی جب سے اب تک تین دفعہ پیشاب کو جاچکا ہوں اور پیشاب مجھے ہر نصف گھنٹے کے بعد آتا ہے اس حساب سے اس وقت چھ بجے ہوں گے اب ہاتھ ہٹا کر گھڑی کو دیکھا تو واقعی چھ بجے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اسی قسم کا ظریف لکھنوی کا ایک شعر ہے۔

ہجر کی گھڑیاں گنا کرتے ہیں عاشق رات بھر
یہ حسین معشوق بنتے بنتے گھنٹہ گھر بنے

بہت ہنسے۔ میں نے عرض کیا کہ ایک دفعہ ٹسکار سے واپسی پر ایک دھوبی سے وقت دریافت کیا۔ اُس نے بھی ایسا ہی جواب دیا تھا کہ میرا گدھا بارہ بجے کے گولے بعد سے اب تک دو دفعہ بولا ہے اس کی عادت ہے کہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد رینگتا ہے اس حساب سے اب ایک بجنا ہوگا۔ اس پر فرمایا کہ ایک شیخ صاحب کو عروجِ ماہ پر چاند کی ہر پہلی تاریخ کو دورہ پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں میں رویتِ ہلال کے بارے میں اختلاف رائے ہو گیا تو ان میں سے ایک صاحب نے یوں تصفیہ کیا کہ جھگڑا کا ہے کا ہے جا کر شیخ صاحب کو دیکھ آؤ دورہ پڑا ہے یا نہیں۔ اگر پڑا ہے تو آج یقینی پہلی تاریخ ہے۔

ایک صاحب کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ صاحبِ ذوق ہوں مگر مفلس۔ براہِ خدا دیوان کا ایک نسخہ مفت عنایت فرمائیے فرمایا یہ حضرت آج خدا کا واسطہ دے کر دیوان مفت مانگتے ہیں ہل فرمائش کریں گے کہ خدا کے واسطے جانکی بائی کا گانا مفت سنوا دیجیے۔ میں نے کہا

ممکن ہی پرسوں کہیں کہ کریں ماڈلین کے برہنہ رقص کا انتظام کرا دیجیے، صاحب ذوق ہوں۔ اس لیے سرختمہ شاید گرفتار بہ میل۔ بہتر یہی ہے کہ دیوان نہ بھیج کر آئندہ مصائب کی روک تھام کیجیے۔ خوب ہنسے۔ دیوان نہیں بھیجا۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

فرمایا یہ فقرہ کہ ”مجھ سے تین پانچ نہ کرو“ کسی موجد کا کہا ہوا ہے اس لیے کہ تین سے مراد تثلیث اور پانچ سے مراد پانچ تین ہیں۔ فرمایا دیکھو میں نے یہ شعر لوگوں کے بناوٹی غم پر کہا ہے یہ غم کیوں کر کہوں کہ حضرت شعیبؑ کو غم نہیں لیکن وہ فریبی میں توستی سے کم نہیں

سید صاحب کے ملاقاتی اور عزیز ایک صاحب ناصر میاں جو دمہ میں مبتلا تھے ایک یکہ میں تشریف لائے۔ سید صاحب نے پوچھا: کیسے آئے؟ انھوں نے کہا بہت دنوں سے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ یکہ میں آیا ہوں۔ یکہ والا کرایہ کے واسطے باہر کھڑا ہے۔ اتنا سن کر سید صاحب سخت بے کیف ہوئے۔ فرمایا: آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ مجھے یکہ میں دیکھنے آئیں۔ اس وقت کرایہ دے دیتا ہوں آئندہ کرایہ کی سواری میں تکلیف نہ کریں۔ ہائے سید صاحب دنیا کو الزام دیتے ہیں اور خود نہ سمجھے۔

جس سے تھا خود داری ارباب حاجت کا نباہ

وہ طریقہ تم سے اے اہل کرم جاتا رہا

مجھ سے فرمایا میں نے آپ کے خاندان اور استعداد کا تذکرہ

کل اپنی ہنیرہ سے کیا تھا۔ وہ کہنے لگیں کہ اگر قمر الدین اپنی شادی ہمارے خاندان میں کرنا چاہیں تو ہو سکتی ہے۔ راجہ میاں کی خوش شکل اور خوش سلیقہ لڑکیاں موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ ہم شیوخ صدیقی اب تک سادات سے نہیں ملے ہیں۔ دوسرے یہ کہ میری شادی خاندان ہی کی ایک لڑکی سے والد صاحب نے طر کر لی ہو ورنہ میں اُن سے تذکرہ کرتا۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ فرمایا۔ آج کل لوگ راحت و عزت کی زندگی سہل نہیں گزار سکتے اب اگر آرام سے جینا چاہتے ہیں تو ہر شخص بادشاہ تو بن نہیں سکتا مزدور بنے۔ اس خیال کو یوں ادا کیا ہے غ

باقی نہیں وہ رنگ گلستان ہند میں

محنت کا اب ہی کام گلستان ہند میں

میں نے عرض کیا کہ اس میں آورد کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔ فرمایا دیکھو قافیہ کی اختراع پر خیال آیا۔ میں نے یوسفستان تراشا ہے۔ محمد علی اور شوکت علی کے قید ہونے پر اس خیال کو کہ انھوں نے جیل جاکر لوگوں کے دل کے خوف سزا کو اشتیاق سزا سے بدل دیا یوں ادا کیا ہے غ

مصریوں نے یوسفستان کر دیا

اب نگاہیں پڑ رہی ہیں جیل پر

میں نے عرض کیا یوسفستان اصل میں عربی کی اختراع ہے۔ فرمایا: مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

یکم نومبر ۱۹۱۶ء

یہ شعر سنایا ہے

پوستین گدا میں پڑ جانا کیا یہی بادشاہ کرتے ہیں

اور فرمایا کہ اگر حکومت درویشوں کو تنائے گی تو اٹ جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ ”درپستین کے افتادن“ عیب چینی کرنے کے معنی میں فارسی محاورہ ہے، اردو محاورہ نہیں ہے، فرمایا میرے نزدیک کسی شعر میں خواہ مضمون نہ ہو اگر زبان کا کچھ لطف ہو تو اسے قائم رہنا چاہیے۔ پھر غور کر کے فرمایا اچھا اس شعر کو کاٹ دو ایٹ آباد کے ایک پنجابی وکیل الف دین نے اپنی تصنیف کردہ ایک کتاب روانہ کی۔ الف دین نام کی عجوبگی نے طبیعت میں گدگدی پیدا کی۔ فرمایا پنجاب میں بھی عجیب عجیب نام رکھے جاتے ہیں چراغ دین گل زنگزار فاطمہ سڑک از کوئے محمد، تھوڑی دیر تک ہنستے رہے۔ پھر وکیل صاحب کو لکھ دیا ہے

الف دین نے خوب لکھی کتاب

کہ بے دین نے پائی راہ صواب

میں نے عرض کیا کہ آپ نے خوب بات پیدا کی اب تک میرے ذہن میں اس قبیل کا شعر آغا شاعر قزلباش دہلوی کا قابلِ داد تھا

جاتی رہی ہر دل سے تمنائے انبساط

جب سے سبق پڑھا ہی الف لام میم کا

فرمایا آپ کو میرا وہ شعر یاد نہیں ہے

الف بے تے ہی کو پڑھ کر میں سمجھا

الف اللہ کا اور ما سوا بُت

فرمایا پچھلی بیماری میں طبیعت زلیت سے مایوس ہو گئی تھی، خدا سے لو لگی ہوئی تھی۔ اس حالت میں یہ شعر کہے تھے۔ خدا جانے کسی قابل

ہیں بھی یا محض ایک مجذوب کی بڑہیں سے
 مجھے کیا خبر کہ ہر کیا اثر نہ وہ ہوش ہر نہ وہ شان ہر
 نقطہ اک نظر ہر جہان پر نہ خیال ہر نہ گمان ہر
 نہ دماغ صرف رہ نظر نہ دلیل باعثِ دردِ سر
 وہی جوشِ حیرت و بے خودی نہ قیاس ہر نہ گمان ہر
 نہ یہاں حدود کا نشان کہیں نہ محلِ حرف و بیاں کہیں
 مرا عشق ہر تراخن ہر مری آنکھ ہر تری شان ہر
 ۳ نومبر ۱۹۱۹ء

مولوی عشرت حسین صاحب کے خسر مولوی احمد حسین صاحب
 مذاقِ نواب پر یا نواں کا تذکرہ نکالا۔ فرمایا ہمارے سمدھی صاحب
 کی ابتدائی تربیت چونکہ حنفی ماحول میں ہوئی تھی تصوف سے طبیعت
 کو لگاؤ ہر در نہ اہل تشیع تصوف و عرفان سے زیادہ سروکار
 نہیں رکھتے۔ انھوں نے ایک کیسا بلند عارفانہ شعر نکالا ہر
 نشان تیرا ہر اک شر سے عیاں ہر بے نشان ہو کر
 تری قدرت کا طوطی بولتا ہر بے زباں ہو کر
 فرمایا اس قافیہ کو میں نے اس طرح باندھا ہر
 زبانیں دیکھتی ہیں آفتِ تقریر کو چپ ہیں
 بنگاہیں داستانیں کہ رہی ہیں بے زباں ہو کر
 دوسرا شعر سنو

کیا اچھا جنوں نے دار پر منصور کو کھینچا
 کہ خود منصور کو نسل تھا جینا رازداں ہو کر

فرمایا: دیکھو میں نے حضرت منصور کو اناحق کہنے پر معذور قرار دیا ہے۔
عرفان ضوئیں ہی شریعت کی آرٹس

آتش فشاں زمین دہی ہے پہاڑ سے
جب آتش فشاں مادہ زور کرتا ہے تو زمین کا طبقہ اڑ جاتا ہے، قلبِ انسانی
زور عرفاں کو کیا روکے۔ میں نے عرض کیا کہ محمد جان قدسی نے
اسی بات کے اظہار کے لیے اس سے زیادہ پیاری تشبیہ سے کام لیا ہے
فرماتے ہیں ۛ

اگرچہ زور کہ زور در شجر طور آتش افروخت زردار بہر منصور آتش
رسوائی حلاج ندارد حیرت ہرگز نہ شود بہ نیبہ مستور آتش
حلاج کی رعایت سے روئی کو منتخب کیا ہے کہ شعلہ کو نہ دبا سکی۔ فرمایا
واقعی خوب کہا ہے مگر میری تشبیہ اس خیال سے جدا ہے اور اول
تو مجھے یہ خیال معلوم بھی نہ تھا۔ فرمایا ایک اور عارفانہ مطلع دیکھو
میں جس کے خاتمہ قدرت کا نقش حیرت افزا ہوں
وہی سمجھے کہ وہ کیا ہے وہی جانے کہ میں کیا ہوں
اس مطلع کو دیکھیے ۛ

جناب حضرت اکبر کی کوئی نبض تو دیکھے
یہ کہنے کو تو ہر حالت میں کہہ دیتے ہیں اچھا ہوں
فرمایا حکومت کی پالیسی کی کامیابی پر دُعا سنو ۛ غ
زندگی ہوئے درازاں کی خوش اقبال کی
مولیٰ صاحب کی نہ چلتی ہے نہ بنگالی کی

ۛ نومبر ۱۹۱۹ء

حصہ سوم کی نقل کے سلسلے میں آیا ہے
 چاہتے ہو تم کسی کو چاہتا ہو وہ تمہیں
 زندگی یہ ہے نہیں تو زندگی اچھی نہیں
 میں نے عرض کیا یہ تو نوشقوں کی سی بے کار گفتار ہے۔ فرمایا: ہاں زرا
 ڈھیلا پن ہے مگر رہنے دو۔ فرمایا ترکی اور ایران کی بربادی اور افغانستان
 پر گولہ باری سے طبیعت پر بار تھا اس کو یوں ہلکا کیا ہے سہ غ
 اپنی تہ میں اسی زمیں اب مجھ کو جائے گور دے
 وہ رہے زیر فلک اللہ جس کو زور دے
 اب تو ہر اہل بصیرت کی خدا سے یہ دُعا
 دفع کر نا دیدنی یا مجھ کو چشم کو ردے

اس شعر پر ہے

ان کے دل میں جو کچھ آتی ہے وہ کہہ جاتے ہیں
 ہم بھی سن لیتے ہیں منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں
 میں نے عرض کیا اس کے دوسرے مصرع میں اگر یوں ترتیم فرمادے
 تو شاید کچھ بہتر ہو جائے:-

اور ہم سنتے ہیں منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں
 فرمایا: نہیں ایسا ہی رہنے دیجئے۔ جب یہ شعر آیا سہ غ
 غیر کی جالوں نے نچ یوں ہی کیا ہے مجھ کو
 آپ کیوں اور اُسے دینے کو شہ جاتے ہیں
 میں نے عرض کیا اس شعر میں نرمی لفظی شرطی رعایتیں اور قافیہ پیمائی
 ہے۔ فرمایا: ہاں اسے نکال دو جب حصہ چہارم ترتیب دوں گا تو ایسے

قافیہ بندی اور لفظی رعایتوں کے اشعار سب نکال دوں گا۔

۸ نومبر ۱۹۱۹ء

مسلمانوں کی تباہی اور حکومت کی بدگمانی کے سلسلے میں فرمایا کہ یہ اشعار میں نے سیاسی نقطہ نظر سے کہے ہیں۔ غ

بھلا کیا پوچھتے ہو حال اکبر ان زمانے میں کہ وہ نیشو بھی ہر سندھستانی بھی مسلمان بھی
عدو کی شست سے بچتے نہیں ہیں یہ کالے ہیں مگر کوسے نہیں ہیں
شکار بدگمانی ہند میں ہم آج ہر سو ہیں مسلمان نہیں ہوتی تو کہہ دیتے ہیں ہند میں
ستم کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں یہ ان کی بدگمانی پر کہ فریادی سمجھتے ہیں
یہ سنانے کے بعد غ

بند نقاب یار نے کھولے تو کیا کروں

منت تو کر رہا ہوں نہ بولے تو کیا کروں

جب یہ شعر آیا

دھکی گراں ہر کشتہ فولاد پر خطر

افیون اب مریض جو کھولے تو کیا کروں

تو میں نے عرض کیا قافیہ گھولے سے آپ کو افیون کا خیال آیا اور
افیون سے دوسری فشی و مقوی اشیا کا۔ دوسرے مصرع میں
”تو کیا کروں“ بے کار سا ہے۔ اگر تبدیل ردیف کے ساتھ یوں ہوتا۔

افیون اب مریض نہ کھولے تو کیا کرے

تو زیادہ موزوں ہوتا۔ فرمایا: ہاں محض قافیہ نے یہ شعر کہلوا دیا ہے، مگر
رہنے دو، کیا کروں

دھوم ہر دل میں مرے قافیہ پیمائی کی جا کے گنگا پہ کہا کرتا ہوں جمائی کی

فرمایا: آپ آجاتے ہیں تو طبیعت بہل جاتی ہے، الہ آباد پر آگ والوں کا شہر ہے، یہاں ہم مذاق کوئی نہیں، آپ کو اپنی مصروفیتوں سے بار بار آنے جانے اور زیادہ ساتھ رہنے کی فرصت نہیں۔ سوچنا ہوں کہ کچھ دنوں کے واسطے دہلی ہو آؤں، گھر کا انتظام کیا کروں۔ عشرت کی بیوی رئیس کی بیٹی ہیں یہاں آکر کیوں رہنے لگیں۔ ایک صاحب میر دوسرے صاحب مولوی صاحب کے یہاں دو دنوں وقت روٹیاں توڑتے تھے۔ ایک شخص نے اعتراض کیا تو کہنے لگے ”کاسینت رہت ہیں؟ ہمارا بیٹا کام دیت ہے“ (کیا مفت رہتے ہیں؟ ہماری بیٹی کام دیتی ہے) عشرت میری بیٹی نہیں مگر میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ برائیوں جاکر رہوں۔ فرمایا دیکھو ان اشعار میں میں نے مذہب سے بیگانہ اہل تشیع پر طعن کی ہے دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم کھلیں گے اک دن غ اس سے کیا بحث ہے کلی ہوں کہ نہ ہوں الفاظ کی موج میں بنے ہیں مومن ” اخلاق میں پیرو علی ہوں کہ نہ ہوں

ذکرِ بہرِ دی مولایہ کھلے پڑتے ہیں خود مگر کیمپ میں ہیں رے پہ پے پڑتے ہیں
فرمایا رے سے مراد صوبہ رے ہے۔ شعر منایا
اودھ کی خوب کٹی چند روز چین کے ساتھ
عجیب عیش رہے ماتم حسین کے ساتھ

۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء

اس کے بعد میری حاضری کا اتفاق نہیں ہوا۔ سید صاحب دہلی چلے گئے۔ وہاں سے خطوط آتے رہے جو گزشتہ باب میں نقل ہو چکے ہیں۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء کو خط سے آمد کی اطلاع پا کر میں حاضر ہوا

دہلی اور سفر کے واقعات بیان فرمائے۔ فرمایا لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اکبر صرف کہتے ہیں کرتے کیا ہیں۔ عزیز مرزا صاحب کے اس کہنے پر واحدی صاحب نے اُن کو جواب دیا تھا کہ کرنے والوں کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے کہ ان کو کوئی اچھا کہنے والا ملے۔ مگر میں کہتا ہوں معترضین میری مجبوریوں پر نظر نہیں کرتے۔ میں اب بُجڑ کہنے کے کڑی کیا سکتا ہوں؟ لوگوں کے ان اعتراضات کا جواب میں نے اس شعر میں دیا ہے۔

عالم معنی میں ہیں اتنا ہی ہم میں زور ہے
ہاتھ میں رعشہ ہے اب لیکن قلم میں زور ہے

۱۲ جنوری ۱۹۲۲ء

سید صاحب دہلی سے آئے تھے تو ایک نوجوان شخص عزیز نامی کو ساتھ لائے تھے جن کے متعلق مجھے دہلی سے ایک خط میں لکھ چکے تھے: ”جو نقل کتاب آپ نے شروع کی تھی وہ کام یہاں ایک خوش عقیدہ نیک نوجوان نے کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ وہ نظر تحقیق کہاں ”آج حاضر ہوا تو ان کے متعلق فرمانے لگے: خواجہ صاحب نے اُن کو اس خیال سے میرے پاس روانہ کیا تھا کہ میرے ساتھ رہیں، حصّہ سوم کی نقل میں مدد دیں اور کوئی نادر بات میرے منہ سے نکلے تو اسے نوٹ کر لیا کریں۔“ ان حضرت نے تو میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ ہر وقت میرا منہ تنکے رہتے ہیں۔ میرے لب ہلے اور ان کا قلم جلا۔ صبح میں نے بیٹھے بیٹھے کہا ”گل من علیہا فان“ ان حضرت نے فوراً کچھ نوٹ کر لیا میں نے بدجھا کیا لکھ لیا؟ فرمایا: یہی لکھا ہے کہ آج صبح آٹھ بج کر دس منٹ پر

حضرت اکبر نے فرمایا ”کل من علیہا فان“ میں نے کہا اللہ تم پر رحم کرے اسے
کاٹو یہ حضرت اکبر کا فرمایا ہوا نہیں حضرت رب اکبر کا ہے۔ فرمایا: میں نے
اسی بات کو یوں نظم کر دیا ہے

سب کو فنا خدا کو بقا بات حق یہ ہے
میں کیا کہوں گا یہ خدا کی کہی ہوئی

۱۴ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء

ایک برہمن اکاؤنٹنٹ آفس میں کلرک تھے وہ سید صاحب کے
یہاں آتے رہتے تھے۔ سید صاحب اُن کی سنسکرت کی ہارت اور ادبی
ذوق کی تعریف کر چکے تھے۔ وہ آج اپنے یمن بچوں کے ساتھ آئے۔ اُن
بچوں کی ماں مرچکی تھی۔ سید صاحب نے اُن کو شفقت سے بٹھایا۔ تھوڑی
دیر بعد پنڈت جی نے کہا آج میرا اور اس بچی کا روزہ ہے۔ اس ارادہ
سے آیا ہوں کہ کچھ خشک بات نہ چلوں وغیرہ سے آج آپ کے یہاں نہ
کھولوں۔ یہ سنتے ہی سید صاحب نے فکر مندانہ انداز سے فرمایا: اجی اس
گھر میں کیا انتظام ہو سکتا ہے، یہاں نوکروں کو خود میرے کھانے کی فکر
نہیں۔ مگر دیکھئے میں روزہ کھولنے کی کوئی سبیل کرتا ہوں۔ نوکروں کو
آواز دے کر کہا ”سلیمان اندر گھر میں سے آپ کو آٹھ دس بادام
لا کر دے دو“ برہمن پر یہ سن کر بجلی سی گری۔ اس کے بعد سے میں
نے پنڈت جی کو عشرت منزل آتے کبھی نہ دیکھا۔ غالباً جُز رسی کے جواز
کے سلسلے میں خیال آیا، مجھے یہ شعر سنا ہے

بارک میں زر دے کے مالی سے گل بے بو
مال ضائع کرنے کا ہے تم کو مایہ نولیس

۲۱ جنوری ۱۹۲۷ء

فرمایا لائد جارج صاحب نے قیام امن کے لیے تمام غیر سیسی دنیا کو عیسائی ہوجانے کی دعوت دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کیا عیسائی قومیں آپس میں نہیں لڑتیں۔ سب کے عیسائی ہوجانے کے بعد بھی حقیقی امن قائم نہ ہوگا۔ حقیقی امن اس وقت ہوگا جب ہرے ایک طرف کر دیے جائیں اور اچھے ایک طرف۔ اور یہ ہونا قیامت میں ممکن ہے کہ دوزخی دوزخ میں ہوں اور خلی جنت میں۔ اس کے واسطے سب کو عیسائیت کی طرف بلانے کے بجائے حضرت عیسیٰ ہی کو دنیا کی طرف کیوں نہ بلالیا جائے کہ قیامت آکر حقیقی امن قائم ہو جائے۔ نقص امن کے موجب حضرت خود ہیں اور اس واعظانہ ہیر پھیر سے دنیا کو دھوکہ دیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: احمق پھوندوی کا شعر ہے

جو مرے بربادی اسلام کی تلقین میں

قبر اس کی ہو گیلڈ اسٹون کی پائین میں

فرمایا: لائد جارج کے اسی خیال سے متاثر ہو کر میں نے کہا ہے غ

کسی کے فتنہ قامت کا ظلم ہو اے حشر

تری طرف سے بھی اٹھے خدا کے کوئی

(یہ دُعا ۱۹۲۷ء میں پوری ہوئی اور مصطفیٰ کمال کے اٹھنے کے ساتھ

لائڈ جارج کی وزارت بیٹھ گئی) فرمایا: دیکھو خدا کے سلسلہ میں خیال آیا

میں نے راجہ اور رئیس لیڈروں کے لیے کہا ہے

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے

محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

دیکھو، خدا پر ایک اور شعر ذہن میں آیا جس طرح مشعلہ کا تصور بغیر روشنی کے نہیں آسکتا اسی طرح ہم کو اپنی زندگی کا احساس بغیر خدا کے تصور کے نہیں ہونا چاہیے مگر افسوس ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ یہ ہماری انتہا درجہ کی حرام نفسی ہے کہ خدا نے خود کو ہم سے ایسا علیحدہ کر لیا کہ اب زندگی میں بسا اوقات اُس کا تصور بھی نہیں آتا اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے سہ غ

طبیعت اس تصور سے بہت مایوس ہوتی ہے
کہ بے یاد خدا بھی زندگی محسوس ہوتی ہے
فرمایہ زرا حسن و عشق کی ایک ادا دیکھنا ہے

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو کیا آتا ہے
میں نے عرض کیا: آپ نے ان دو مصرعوں میں جہانگیر اور نور جہاں کے سوال جواب سے زیادہ لذت بھردی ہے۔ جہانگیر نے جب ناراض نور جہاں کے سامنے یہ مصرع پڑھا تھا۔ ع
نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم
تو نور جہاں نے جواب دیا تھا۔ ع
بلے از مردم بلے دست دبا دیگر جہ می آید

۲۲ جنوری ۱۹۲۰ء

فرمایا انسان جس طاقت سے چاہے لڑے لیکن فطرت سے نہیں لڑ سکتا۔ ایک لیڈر نے فطری نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی جہان لڑکی کو موقع دیا کہ ایک غیر قوم خوب صورت اور قابل

نوجوان سے بے تکلف راہ ورسم رکھے۔ چند دن نہیں گزرے کہ وہ اس لڑکی کو لے بھاگا۔ اس پر مجھے پہلے یہ مضمون سوچا کہ ”یہ گیا سے باز آئے وہ بٹیا سے باز آئے“ مگر یہ خیال ابھی طرح نظم نہ ہو سکا تو یوں کر دیا یہ غ

ساتھ اڈیٹر کے ہو گئی رخصت انڈینٹ کیوں کیا تھا اسے
اس سے مجھے خیال آیا کہ ان لیڈر صاحب نے عزیز مصر کی غلطی کی تھی
کہ یوسف جیسے حسین و جمیل نوجوان سے بے تکلفی بڑھانے پر بی بی زلیخا
کو منع نہ کیا یہ

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی
فرمایا رسول اللہ نے ہم کو مسلمان بنایا تھا مگر اہل یورپ نے (چونکہ خود
عیسائی ہیں) ہمیں محاذ بن مشہور کر دیا۔ افسوس یہ ہے کہ یہ نام ہمیں طعنہ
(Nickname) نہیں معلوم ہوتا۔ فرمایا ایک صاحب نے ہمارا
کشن پر شاد بہادر کا یہ شعر سنایا یہ

اچھے وہی جو جل کے تیری خاک رہ بنے
مٹی خراب طالب گورو کفن کی ہو
اس شعر کے ایک پہلو کے زور کو دیکھ کر میں نے اس کے دوسرے پہلو
پر خیال کیا اور خیال کو اس طرح ادا کیا یہ
دیر میں عاشقوں پہ ظلم یہ ہو بعد مرنے کے بھی جلاتے ہیں

۶ فروری ۱۹۲۰ء

نوٹ بک کھول کر یہ شعر سنائے یہ غ

کیٹی کل ہوئی برگیڈ میں میں خاموش بیٹھا تھا
 طلب میں اپنے حصے کے ہر اک ممبر نے منہ کھولا
 کیٹی جب ہوئی برخاست اور حصہ ملا سب کو
 چھ ماشہ سونا ہر اک کو ملا اور مجھ کو اک تولا
 کہا صاحب نے یہ انعام دو ہر اتم کو ملتا ہے

سبب یہ ہے کہ تم چپکار رہا اور کچھ نہیں بولا
 فرمایا: مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ وفاکیش لوگ حکومت کی کھلی ہوئی شاد
 صفت کرتے ہیں اور علانیہ اشتراک عمل کا ثبوت دیتے ہیں مگر حکومت
 ان کی ہمدردی کو اتنا خیال میں نہیں لاتی جتنا ان خموش اور ذہین لوگوں
 کا لحاظ کرتی ہے جو اعتراضات سے زبان روکے ہوئے ہیں جیسے ڈاکٹر
 شاہ سلیمان حکومت ایسے لوگوں کی خموشی کو اپنی بڑی اعانت سمجھتی ہے کہ
 اگر یہ بھی موتی لال و جواہر لال بن جائیں تو خدا جانے کیا قیامت ڈھائیں۔
 ان خیالات کو اپنے ان تین اشعار میں نظم کر دیا ہے۔ میں نے عشرت حین کو
 لکھا تھا کہ ان خیالات کو شائع کرنا مناسب ہے یا نہیں لیکن انھوں نے
 نہ معلوم کیا سمجھ کر کچھ جواب نہیں دیا۔ آپ مشورہ دیجیے کہ ان کو شائع
 کروں یا نہیں میں نے کہا آپ نے جو مضمون زبانی بیان فرمایا وہ اول
 تو فی بطن شاعر ہے اشعار سے بہ تمام و کمال ظاہر نہیں ہوتا اور کچھ ظاہر
 بھی ہوتا ہے تو ایسی بے ضرر تنقیدیں تو آپ حکومت پر اس سے قبل
 بھی کر چکے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں تبدیل سلطنت پر آپ نے کہا تھا

قدم انگریز کلکتہ سے دہلی میں جو دھرتے ہیں
 تجارت خوب کی اب تمہیں شاہی کیسے کرتے ہیں

دل کا آٹا ہر نل کا پانی ہو اب دو آٹے پہ حکمرانی ہو
 ۱۹۱۲ء میں پانی کے نل بند ہونے کے باعث رعایا نے دہلی کو سخت
 تکلیف محسوس ہوتی تھی تو کہا تھا حکومت نے رعایا کے دانے پانی دو لوہا
 پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مجھے ان بریگیڈ داے اشعار میں معمولی تنقید و مذاق
 معلوم ہوتا ہے بلکہ غور فرمائیے تو اس میں گورنمنٹ کی تعریف نکلتی ہے کہ
 لائق اور غیر جذباتی معاملہ فہم اور کم گو اشخاص اُس کے صلہ سے محروم
 نہیں رہتے، ہر پیش میں حکومت کو یہی کرنا چاہیے۔ فرمایا: نہیں آپ کو
 مسٹن گردی کا حال نہیں معلوم ہے جس سے میں بمسکل نکلا ہوں۔ دیکھو اس
 شعر میں میں نے مسٹن صاحب کی سختیوں کی نکسایت کی ہے۔

ہر منع ملاقات میری ہمنفسوں سے

فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے

مگر خیر میں نے بھی اپنے تائے جانے کا مسٹن صاحب سے یہ کہہ کر رنج
 کم کر لیا ہے

خانہ دل کو مرے توڑا تو کیسا ایسی نمود

چشم بد دُور آپ تو ہیں مسجدیں ڈھائے ہوئے

اشارہ کانپور کی مسجد کی طرف ہے۔ غرض کہ یہ

رکعتی ہیں بھونک بھونک کے باتیں مری قدم

تیغ زباں نہیں ہے عصائے زباں ہے اب

کون پھر سوال جواب کی مصیبت میں پڑے، ان اشعار کو شائع کرنے

میں ابھی عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا خیر، یہ شعر سنئے

جھکا سکتا ہوں میں سر کو زباں کو ردک سکتا ہوں

جواب اس کا مگر کیا ہو کہ تو کا فر نہیں دل سے
 دیکھو یہ شعر میں نے مرگ ہاشم پر کہا تھا سہ غم
 دل ہی کو غم نہیں کہ ہوا مبتلائے غم
 غم بھی بلا میں ہو کہ ہوا مبتلائے دل
 فرمایا: عشرت میاں نے ایک فلسفہ کی انگریزی کتاب دی تھی اس کے
 مطالعہ کے بعد ایک خیال کو یوں نظم کیا ہو سہ غم
 رنج آسماں میں ہو نہ راحت زمیں میں ہو
 اپنے ہی حس کا جوش ہو سب کچھ ہمیں میں ہو
 میں نے عرض کیا کہ اپنے ہی حس کے جوش کو میں نے یوں ادا کیا ہو سہ
 دنیا ہو اپنی شکر و شکایت پہ منحصر
 گلشن بھی ہو اور یہی زندان زندگی
 رنج و راحت کا فلسفہ یوں عرض کیا ہو سہ
 غم سے ناحق سب ڈرتے ہیں کچھ جو ہر غم سے ابھرتے ہیں
 رنج و راحت دو بازو ہیں مالک کوئی بازو کم نہ کرے
 فرمایا: اور شعر سنو سہ

دل شکستہ میں اک ساز دل نواز بھی ہو
 لرز رہا ہوں میں جس سے اُسی پہ ناز بھی ہو

۱۴ فروری ۱۹۲۰ء

میرے ایک خوش فکر دوست مولوی نجم احسن صاحب نگرانی
 ساتھ تھے، انھوں نے کسی کا یہ شعر سنایا سہ
 گل لعل افسردہ سبزہ شمع گل بالین اداس جی بھر آیا حالتِ گورِ غریباں دیکھ کر

کسی اور کا اچھے سے اچھا شعر ہوتا تو سید صاحب اُس کی داد دینے کی بجائے سکوت اختیار فرمایا کرتے تھے مگر اس شعر کی دل سے داد دی فرمایا: میرا بھی ایک شعر ہر ٹکڑے بہت ملتے ہیں ۛ

باغبان خاموش گل افسردہ اور گلشن آداس

جب ہوا بدلی تو ساری زیب درزیت اُٹھ گئی

فرمایا: دیکھو میں نے اپنے ایک عزیز پر طعن کی ہر جو شیعہ ہو جانے کے

بعد دوسروں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ اس کیش میں آجائیں ۛ غ

حضرت کی معاشرت بہت اچھی ہے مشہور ہیں انتظام راحت کے لیے

اپنے مذہب میں کیوں بلاتے ہیں مجھے جنت کے لیے کہ لطف صحبت کے لیے

فرمایا: سنی شیعہ کے فسادوں نے یہ اشعار کہلوائے ۛ

کہاں دلوں سے شریعت کا کام چلتا ہے فقط زباں سے بزرگوں کا نام چلتا ہے

ہوئی طریق بزرگاں کی پیروی مفقود بس ان کے نام پہ بٹھ صبح و شام چلتا ہے

فرمایا: دیکھو امان سبھا کے ممبروں کا خیال آیا جو حکومت کے مذاج د

مُہم ہیں، ان کی نفیات ان کی اپنی زبان سے ادا کی ہر ۛ غ

بُتوں کی بات سے دل مائل فریاد ہوتا ہے

مگر کہنا ہی پڑتا ہے بجا ارشاد ہوتا ہے

مرے صیاد کی تعلیم کی ہر دھوم گلشن میں

یہاں جو آج پھنسا ہوا کل صیاد ہوتا ہے

انصاف یہ ہر کہ ۛ

طلب جاہ پہ کرتے ہیں وہ کس کو مجبور

سچ تو یہ ہر کہ ہمیں لوگ غضب کتے ہیں

۱۹ فروری ۱۹۲۰ء

ترکی کی تباہی کے سلسلے میں فرمایا کہ مسلمانوں نے خود تو مقامات
مقدسہ فتح کرادیے اب ڈیپوٹیشن لے کر ولایت پہنچے ہیں۔ میں نے اسی
پر کہا یہ سہ غ
بھائی کی ٹانگ توڑتے ہیں غیروں کے ہاتھ جوڑتے ہیں
اور سُنو سہ غ

ہیں وفد اور اہلین فریاد اور دلیلیں
اور کبر مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں
اصل یہ ہے کہ یورپ کی سیکڑوں برس کی تنہا اب پوری ہوئی ہے کہ اسلام
ان کی آستان بوسی کرے۔ تھوڑی دیر غور کر کے فرمایا سہ غ
خیر ہو قبلہ کی لندن کی طرف بھاگے تو ہیں
دوسرے مصرع کی فکر میں رہے مگر نہ ہو سکا۔ فرمایا: دیکھو اس خیال کے
تحت کہ اب مسلمان اہل یورپ سے تنگ آکر ہندو سے میل کرنا چاہتے
ہیں ایک دیہاتی کی زبان سے کیا اچھا مصرع آیا ہے سہ غ
روٹھ کر اُن سے میاں ہمرے گلے لائے تو ہیں
فرمایا کہ گاندھی ہندو مسلم اتحاد چاہتے ہیں مگر ہندو ابھی مسلمانوں سے
میل کرنے میں کھٹکتے ہیں۔ میں نے اس خیال کو ایک لالائے کے
منہ سے یوں ادا کر لیا ہے سہ غ

جان اُن کی کہیں ترک موالات نہ مارے
ڈرتی ہوں کہیں ترک موالات نہ مارے

۲۶ فروری ۱۹۲۰ء

فرمایا: سرسید نے چند دن کی بھیک کو فیشن میں داخل کر کے نہایت تکلیف دہ حد تک وسیع کر دیا ہو۔ کل چند خوش پوش اصحاب ایک ڈیپوشن کے سلسلے میں تشریف لائے تھے کہنے لگے: سرزمین حجاز میں یہاں سے جا کر سیکڑوں حاجی بیمار پڑ جاتے ہیں، وہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ آخر میں ان کی خبر آتی ہو۔ اس لیے ہم نے ایک کمیٹی بنائی ہو کہ کچھ ہندوستان سے اہلکار وہاں روانہ کیے جائیں کہ وہاں حاجیوں کو تکلیف اور موت کے جنگل سے بچاسکیں آپ کے پاس اسی لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اس کارِ خیر میں کچھ شرکت فرمائیں۔ میں نے کہا کہ یہ کارِ خیر ہو یا کارِ معصیت؟ آپ کو کس نے صلاح دی کہ اس گناہ میں خود بھی شریک ہوں اور دوسروں کو بھی لپیٹیں۔ اجی! ہرنیک دل حاجی کی خواہش بھی ہوتی ہو کہ وہ سرزمین پاک اُس کے جسم کو قبول کرے اور اس کا حشر و نشر اُس خطہ مقدس سے ہو جہاں حضور سرور کائنات آسودہ ہیں۔ آپ حلاج کی اس سعادت میں حائل ہونے والے کون اللہ اللہ کیجیے، مگر میں بیٹھے، دنیا کو اس معصیت میں شرکت کی دعو دیتے نہ پھرے اور مجھے معذور رکھیے۔ یہ سن کر اراکین وفد تھوڑے تک میرا منہ دیکھتے رہے پھر کچھ کہنے کی بہت نہ پڑی۔ خاموش واپس چلے گئے ہیں نے انھیں موافق کے لیے کہا ہو۔

قوم غریب تنگ ہو چندوں کی مانگ سے
کالج کے چوٹے پلے ہیں بڑی کی مانگ سے

۲ مارچ ۱۹۲۰ء

ایک بڑی ڈبل روٹی لے کر حاضر ہوا جو میں نے کڑھ میں

سید صاحب کے لیے تیار کرائی تھی۔ دیکھ کر خوش ہوئے کہنے لگے اتنی بڑی
ڈبل روٹی! یہ تو اچھا خاصا کسی یورپین کا چوڑا ہی مگر زرا سا ٹولا ہی ڈبل
روٹی کے بالائی حصے کی سُرخ کو آج نے کچھ ماند کر دیا تھا، خیر کوئی ہرج
نہیں۔ آپ کو میرا وہ شعر تو یاد ہوگا کہ

کاش کر لے مجھے وہ شاہد ہوٹل منظور

کیک تو روز ہی اک رات تبخن بھی سہی

میں نے عرض کیا کہ یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ ورنہ بقول ذاکر
غازی آبادی سے

بھوکے عاشق کے واسطے ذاکر گال سے شیر مال اچھا ہو

نہیں تخصیص زلف کی کوئی آپ کا بال بال اچھا ہو

اس سلسلہ میں کسی اور ہزل گو کی تشبیہ بھی دیکھیے

تھی جوانی میں جو میڈم نان پاؤ

اب بڑھاپے میں ملائی ہو گئی

۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء

آج بہت افسردہ خاطر پایا۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا بھرے بیٹھے

تھے، تیزی حس انسان کے لیے عذاب ہو وہ بھی ان جیسے ذکی شاعر

کی، عشرت حسین صاحب اب اس حالت میں ان کی دُنیا تھے۔ اپنی

محبت و سعادت سے ان کا دل اپنے ہاتھ میں لیے رہتے تھے۔ مگر

آج سید صاحب اپنے بعض اعزہ و اقربا کے خلاف آگ برسانے لگے۔

کہیں تحریک یہ کر دی گئی تھی کہ آپ الہ آباد چھوڑ کر پریانواں میں رہیں۔

اس پر کہنے لگے کہ بدخواہوں کی خوشی یہ ہو کہ میں الہ آباد چھوڑ دوں

اُن لوگوں کو ہرگز یہ منظور نہیں ہو کہ میرے ایک نامکارہ وجود کے عث
 عشرت منزل اتنی بڑی کوٹھی رکی رہے، میری موت کی دعائیں مانگتے
 ہیں اور ترکیبیں سوچتے ہیں کہ میں اسے خالی کر دوں۔ لیکن میں کیا
 کروں موت میرے اختیار کی بھی تو نہیں اور مجھے اب زندگی میں
 لُطف بھی کیا ہے۔

بوڑھوں کے ساتھ لوگ کہاں تک وفا کریں

لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

میں نے کہا آپ کیوں دل کو خون کیے ڈالتے ہیں۔ جب آپ نہیں
 چاہتے تو عشرت حسین بھی کبھی نہ چاہیں گے۔ زندگی بھر آپ سے عشرت
 منزل کوئی نہیں بھڑا سکتا۔ حضرت سرمد کی رباعی سُنیں۔

رباعی

مرگ است در ایں بادِ یُنْبالِ تُرا این ست آل کار از مالِ تُرا

اذل محنت و آخرش حسرتِ ست ایں مال کند ہمیشہ با مالِ تُرا

فرمایا: سچ ہی، افسوس ہے

جان دینا منع ہو اور دل سے غم ملتا ہے سانس لیتا ہوں مگر کام اس کچھ چلتا ہے

تپ ہونے سے نہ سمجھو کہ میں احت میں ہوں دل میں انگارے بھرے ہیں گریبن جلتا ہے

میری حالت اُس زندہ مگر کچلے ہوئے کیڑے کی سی ہے جس کو جیونٹیوں

نے کھانا شروع کر دیا ہو۔ وہ کہتا ہے ارے ابھی مجھ میں جان اور جس

ہے، زرا ٹھہر جاؤ، میں بے جان ہو جاؤں تو کھا لینا۔ مگر جیونٹیاں اس کو

جواب دیتی ہیں کہ چلو بیٹھو، تم اب نہ مرے چند منٹ بعد مر جاؤ گے

تمہارے مرنے کے انتظار میں یہاں اپنی دعوت ملتوی کون کرے؟

عقرب طینت اقربا کی اسی نیش زنی نے مجھ سے یہ شکر کہلوائے سے
 وہ چاہتے ہیں اس کو دم دے کے میں بلاؤں
 یاں دل میں یہ ٹھنی ہر مرجاؤں اور نہ جاؤں
 اظہار عقل میں ہیں اجباب گرم کوشش
 اور مجھ کو فکریہ ہر اپنا جنوں چھاؤں
 ساز طرب ملا کر بیٹھے ہیں سُنتے والے
 پھر میں فناءِ عنسم کیوں کر انھیں سناؤں
 میری طرف سے کیوں وہ مایوس ہو رہے ہیں
 بیمار تو پڑا ہوں ممکن ہر مر بھی جاؤں

۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء

تعلیم کی خرابی کے سلسلے میں فرمانے لگے: اس کا مضمر اثر ذکور

سے زیادہ اناٹ پر پڑتا ہے (Ready) (Lazy)
 اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے خدمت میں ہیں مہ لیزی اور ناپختہ کوڑی
 تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی
 میں نے عرض کیا کہ اس مضمون کو آپ کے رنگ میں من نے بھی یوں
 دیکھا ہے

تمام شہر سے بی بی کا دوستانہ ہوا

کلب ہوا مرا گھریا غریب خانہ ہوا

فرمایا: مردوں پر تعلیم کا اثر دیکھو

قائم ہوئی ہر رائے یہ اہل شعور کی

خواہان نوکری نہ رہیں طالبانِ علم
 عہدوں سے آ رہی ہر صد اور ڈور کی

کالج میں دھوم مچ رہی ہر پاس پاس کی

اور منوسہ غ

بہارِ عمر گزری ساہائے امتحانی میں
ہمیں تو پاس ہی کی فکر نے پیا جوانی میں
تھوڑی دیر بعد فرمایا: دیکھو کیا اچھا مصرع آیا ہے۔ غ
پہلے بی لے تھے اور اب بیمار ہیں
میں نے کہا خوب ہے دوسرا مصرع بہم پہنچائیے۔ مگر دوسرے مصرع کی
فکر کے بجائے اُن کا نکتہ رس ذہن اسی مصرع کے ساتھ کھیلتا رہا
کہنے لگے ”بیمار“ میں بی کو Bee سمجھو یعنی شہد کی کھی، اس کے ساتھ
”مار“ لگا دو بیمار کے معنی ہو جاتے ہیں۔ کھی مار یعنی بے کار۔ یہی
وجہ ہے کہ یہ

ہیں عمل اچھے مگر دروازہ جنت ہی بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں
مبری دیکھنی کے تذکرے پر فرمایا یہ

دیکھنی میں چندہ دیا کیجیے ترقی کے ہتھے کیا کیجیے
فرمایا دیکھنی کے ایک نئے معنی میرے ذہن میں آئے ہیں۔ میں نے کہا: وہ
کیا؟ فرمایا: دیکھنی کے معنی ہیں ’بیاد و بخور‘ میں نے کہا: وہ کیسے؟ فرمایا: دیکھنی
مرکب ہے ’کم‘ (Come) اور ’اٹی‘ سے ’کم‘ کے معنی ’بیا‘ اور ’ایٹ‘ (eat)
کے معنی ’بخور‘ اور ’اٹی‘ میں ”ی“ بنتی ہے یہی لوگ ہیں جو دعوتیں بھی کھایا
کرتے ہیں اور روپیہ بھی ع۔ غ

یہ قوم تو بے پر گراڑتا ہی زبرد قوم

۳۰ مارچ سنہ ۱۳۲۷ھ

فرمایا: ہماری بڑی نادانی ہو کہ آپس میں زرا زراسی بات پر فحشیت جاتے ہیں۔ انتہا پسند کہتے ہیں: ہم اچھے ہیں؛ اعتدال پسند کہتے ہیں ہم اچھے ہیں۔ علی گڑھ والے کہتے ہیں: ہم اچھے ہیں؛ ندوہ والے کہتے ہیں ہم اچھے ہیں۔ حالانکہ حقیقت دیکھو تو سب برطانوی معدہ میں کیلوس بن رہے ہیں۔ ہماری بالکل وہی حالت ہر جو مختلف غذاؤں کی انسانی پیٹ میں ہوتی ہے۔ گیہوں کہتا ہے میں اچھا ہوں، چاول کہتا ہے میں اچھا ہوں، فیرنی کہتی ہے میں اچھی ہوں، لٹو کہتا ہے میں اچھا ہوں۔ ان سب کی کیٹی دیکھ کر معدہ کہتا ہے: رات بھر جو چاہے خود سٹائی کر لو، اتنا تو میں جانا ہوں کہ صبح تم سب کو بھنگن لے جائے گی۔ ہائے

کہوں کس کو یہ وقت میں زیادہ اور یہ کم ہیں
ہر اک ذرہ کو دعویٰ ہے کہ ہم بھی جزو عالم ہیں
سید صاحب کی یہ تشبیہ کئی دن تک دماغ میں ایک کیفیت پیدا
کرتی رہی آخر میں نے اس کو یوں نظم کر دیا ہے

پیٹ میں ہوتی ہے ایک کیٹی شب بھر	بحث کرتی رہیں آپس میں غذائیں اکثر
کہا چاول نے میں ہوں عام غذائے عالم	سارے غلوں میں نہیں کوئی بھی مجھ سے تر
بولایا گیہوں تو غذا ہو کہ نرا بانی ہو	میری طاقت ہے مسلم نہ بہت بک بک کر
جب چنے نے یہ سٹائش میں آکر بولا	زور و طاقت میں تو تم دونوں کے میں سے کچھ
مجھ میں طاقت کے ہوا لذت ارزانی ہو	ان محاسن کے ہیں ہر دہن اس پ دہن
کئی اقام کی بتی ہے مٹھائی مجھ سے	جاتا ہے مجھے ہر صاحب لذات و نظر
سن کے فیرنی بڑھی اور چنے سے بولی	یہ تو تھا میری فصیلت کا سر اسر سفر
میری خوبی کی ہے یہ لیک دلیل ادنیٰ	لوگ کھاتے ہیں مجھے پیٹ بھرا ہونے پر

بڑھکے ہونے پہ تجھ کو جو لگائے کوئی منہ
 سن کے فیرنی سے بولا یہ چنا جل بھن کر
 حسن ہی دیکھا برائی پر کبھی کی نظر
 الغرض جب نہ ہوا طم کہ ہی فضل ترکون
 بولا معدہ میں عمل سب پہ کروں گام کیا
 شب ابھی باقی ہر بن لومیاں مٹھو کچھ دیر
 میں اک افسر ہوں میں صوفی ہوں میں عالم ہوں میں سیٹھ
 سب کو مارا اسی اغوائے فضیلت نے تیر

۴ اپریل ۱۹۲۰ء

الہ آباد کے محکمہ نشر و اشاعت کے کمشنر مسٹر گوج کی چٹھی آنے
 کا حال بیان کیا کہ لکھا ہو کہ جو اشعار نان کو آپریشن Non-cooperation
 کے خلاف کہے ہوں، وہ روانہ کیے جائیں۔ فرمایا: پنشن کی اجرت میں
 ایسی خدمت چاہی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ابھی تک ایسے اشعار
 نہ کہے ہوں تو کہو یا کم از کم نان کو آپریشن کی موافقت میں کچھ نہ
 ہو۔ فرمایا: دیکھو میں نے انھیں خیالات کو یوں نظم کیا ہے کہ
 بھرتے ہیں میری آہ کو فوٹو گراف میں کہتے ہیں فیس لیجے اور آہ کیجے

آج کل اس انجمن کے کچھ عجب سلو ہیں میں کہتا خوب ہیں وہ چپ بھی کرتے خوب ہیں
 فرمایا: ترک ملازمت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ عام طور پر قابل عمل
 نہیں ہے اور جن سے ممکن ہو وہ کریں۔ ترک ملازمت میں زیادہ زور
 اس پہلو پر دیا جانا چاہیے کہ لوگ ان محکموں میں ملازمتیں نہ کریں

جن سے ملک و ملت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں نے اسی پر کہا ہے۔

قدرت سیر جو حاصل ہو تو دیوار نہ بن
 پنچہ غیر میں رہتا ہے تو تلوار نہ بن
 فرمایا: دیکھو میں نے ان اشعار میں دفعہ ۱۴۴ کی زبان بندی کی طرف
 اشارہ کیا ہے۔
 زیادہ گوئی سے اب ہم اسی سے نکلے ہیں جو خوب کہتے ہیں اکبر وہ کہ بھی چکے ہیں

زمانہ جانب انصاف ٹھل ہی جائے گا غ زبان بند کرو حال کھل ہی جائے گا
 ۳۱ اپریل ۱۹۲۰ء

متعدد اشعار سنائے جب اس شعر پر آئے۔

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہو آگ

اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

تو فرمایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ چوک کی دوکانوں میں آگ لگی۔ اُس وقت

پائپ بند ہونے سے رعایا کا سخت نقصان ہوا۔ میں نے مذکورہ شعر

اُس خیال سے متاثر ہو کر کہا تھا۔ کیا کہا جائے۔ صاحب کی

آب و دانہ پہ حکمرانی ہے

اگر اس وقت زمانہ سابق کی طرح کنوئیں ہوتے تو آگ بر وقت قابو میں

لائی جاسکتی تھی۔ شہروں میں ترمیم دیکھو کہ حکمران طبقہ اور امرا سول لائن

میں ہیں، غریب کے لیے زسیت کے دن گزارنے کے واسطے شہر کے گندے

گوشتے علیحدہ ہیں۔ مراد اس سے یہی ہے کہ امیر و غریب نہ یک جا ہوں گے

نہ ایک دوسرے کے دکھ درد سے ہمدردی ہوگی۔ اس کی خلوص محبت سے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کے مسئلہ کو تقویت پہنچتی ہی شعر سنایا۔
غ جو خوش کرے گا چاہے گا مجھ کو بھی خوش کرو
دنیا میں بے غرض کوئی راحت رساں نہیں

پھر فرمایا: نہیں دوسرا مصرع اس طرح بدل دینا چاہیے۔ ع
اس کو سمجھ کے تو کوئی منت قبول کر

سید صاحب ایک چھوٹا گاڑے کا تہہ باندھے بیٹھے تھے، پھر وہ نے بیروں میں کٹاٹو طفیل ملازم سے کھانے کے واسطے کہا۔ کھاتے کھاتے طفیل کا ہاتھ ایک گٹھی پر پڑ گیا جو گھٹنے کے قریب یہ صورت بد گوشت تھی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”اے ہی“ اس سے پوچھا کیا ہوا۔ اس نے کہا آپ کے پیر میں بھوڑا ہی۔ یہ سن کر خود بھی بولے ”اے ہی“ اس نے دریافت کیا کیا دکھ گیا؟ فرمایا نہیں، مگر تو نے کہا ”اے ہی“ میں سمجھا شاید دکھ گیا ہوگا، اس لیے میں نے بھی کہہ دیا اے ہی۔ مجھ سے فرمایا یہ بد گوشت میرے ایک زمانہ دراز سے ہی، اس میں کوئی حس نہیں ہے۔

فرمایا یورپین عورتوں کی ترقی کی تقلید ایشیائی عورتیں بھی کرنا چاہتی ہیں میں نے اس پر کہا ہے

سایہ مدت ہوئی عبارتہ بنا پانچوں میں بھی اب بھری ہوئی
دریافت فرمایا بی بی کو راضی رکھنے کا نسخہ آپ کو معلوم ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: بی بی اگر نئی روشنی کی ہو تو اس کے چال چلن پر اعتراض نہ کرو اور اگر پُرانے خیال کی ہو تو اپنا چال چلن درست

رکھو، ہمیشہ زندگی اچھی کٹے گی۔ میں نے عرض کیا: خوب سے
 شر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
 دل پہ گزری ہوئی ہوا رکوی بات نہیں

۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء

فرمایا: دیکھو میں نے اپنے خیالات چھپانے کی وجہ اس شعر میں ظاہر
 کی ہے

کھولی نہیں زباں کبھی فریاد کے لیے
 آواز کیوں نشانہ ہوسیتا د کے لیے

میں نے کہا: میرے شاگرد افغان پرنس سردار محمد عمر خاں صاحب اپنے والد
 سردار محمد ایوب خاں صاحب کے متعلق فرماتے تھے کہ اُن کی قادر اندازی
 کا یہ حال تھا کہ تلوار کی دھار پر گولی مار کر گولی کے کٹے ہوئے دونوں ٹکڑے
 برابر تول کر تبا دیتے تھے۔ سرحدی بھانوں کے متعلق سنا تھا کہ شب میں سگریٹ
 کی روشنی پر فیر کر کے دشمن کے منہ میں گولی اتار دیتے ہیں۔ آپ کا
 سیتا قادر اندازی میں ان لوگوں سے بڑھا ہوا ہے کہ محض آواز پر بے خطا
 نشانہ لگاتا ہے۔ فرمایا: اور مئی سے غ

اک غل مچا کہ اس پہ بھی لیسنس ہی ضرور
 منہ کھل چکا تھا ورنہ مرا آہ کے لیے

فرمایا: دیکھو افغان شہزادے بہت پسند کریں گے میں نے فارسی کے دو
 اشعار سے ایک حکومت دوست وزیر کی بڑوں دعوت کی ہے: وہ خود
 اپنی زبان سے کہتا ہے: غ
 برائے من بہر سخت خویش جا کردی دلِ حریص مرا غافل از خدا کردی

مراست ناز و نمختہ زرد بست آمد تراست خندہ و بازی کہ خربست آمد
 میں نے کہا آپ کی مراد غالباً صاحب سے ہے بہت خوش ہوئے۔
 فرمایا: ماشاء اللہ آپ خوب پہنچے۔ دیکھو اس خیال نے ایک شعر اور یاد
 دلایا۔ اکثر اہل ملک اس کا نصفہ نہ کر سکے کہ گاندھی کے ساتھ ہوں یا جس
 کے کیمپ میں جائیں ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ غ
 پر ہو تو اوج ڈھونڈو خر ہو تو گھاس دیکھو
 ہم کیا بتائیں تم کو اپنی بھکاس دیکھو
 فرمایا: حکومت اور قوم دونوں کو جو خوش رکھنا چاہتے ہیں ان کے متعلق
 اظہار خیال دیکھیے غ

اونٹ میں سروس بھی پرا نوار ایمانی بھی ہیں
 آپ کسریٹ میں بھی ہیں نذر قربانی بھی ہیں
 میں نے عرض کیا کہ میں نے بھی اس بات کو کہ ”ہم خدا خواہی و ہم دنیا
 دوں“ ایک تمثیل کی مدد سے یوں ظاہر کیا ہے کہ
 رب مل چکا اگر ہوں بُت نہ جائے گی
 پتھر کی ناؤ کیسے کنارے لگائے گی
 فرمایا کہ اہل ہندو نے گائے مفید ہونے کے باعث اُس کو مرکز مقدس
 تک پہنچا دیا اور معبود اور ماما بنا دیا نیز مسلمانوں سے فتوے لینے لگے
 کہ گائے کو حلال نہ کیا جائے۔ چنانچہ غ
 بھلا ہے یہ کچھ روز سے فتوے نر قوم
 گایوں کو جو تاکے وہ بیشک ہر خیر قوم
 میں کہتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں گائے بہت مفید ہے تو عربستان میں

اونٹ - اونٹ کو اپنی خدمت کے مد نظر مسلمانوں سے یہ شکوہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں کی طرح اُس کی آرام رسانی کی کچھ داد نہ دی۔ میں نے اس پر کہا ہر سے غ

چھوٹیں جو گائے مانا حسرت سے اونٹ بولے
 افسوس شیخ جی نے ہم کو پتہ نہ سمجھا
 فرمایا دیکھو اس خیال کو کہ مذہب اور بزرگوں کو گالیاں دینے کا سبق طلبا
 کو اہل یورپ نے سکھایا ہے اس طرح ادا کیا ہے غ
 باقی نہیں دلوں میں اللہ کا ادب کچھ
 یہ ناز نہیں جماعت غائب کرے گی سب کچھ
 فرمایا: قدامت پسندی پر ایک شعر اور سنئے ہے ع
 بے فائدہ ہے اکبر اب تم کو شوق اس کا
 سائنس کی سڑک میں جنت بھی آگئی ہے
 فرمایا زرا اس شعر کو عارفانہ رنگ میں دیکھئے ہے غ
 ابھارا تھا بہت ای جان جاں شوق رسائی نے
 مگر مہت نہ بندھنے دی تیری دیر آشنائی نے
 اس مضمون کا کسی اور کا شعر بھی کیا خوب ہے
 زمانہ چاہیے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اس کا
 بہت دیر آشا ہے ای جبین شوق ناز اس کا

۲۷ اپریل ۱۹۲۷ء

اجاب میں سے کسی نے مشورہ دیا تھا کہ سید صاحب خان بہادر
 کا خطاب واپس کر دیں۔ کہنے لگے کہ یہ خطاب مجھ کو گورنمنٹ نے جوڈیشل

سر دس کے صلہ میں دیا ہی، اگر میں اس کو واپس کر دوں تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ میری ایماندارانہ خدماتِ عدالت کا جو اعتراف کیا گیا ہے میں اس سے ناراض ہوں اس طرح دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع دوں کہ میں نے عدالتی خدمات بے ایمانی اور نا انصافی سے انجام دی تھیں تو کوئی صاحب اچھا مانیں یا بُرا میں خطاب واپس کر کے بے ایمان مشہور ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ سنتا ہوں کہ اپنا خطاب حاذق الملک حکیم اہل خاں صاحب نے واپس کر دیا ہے اگر ایسا کیا تو انھوں نے ایک فعلِ عبث کیا۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا اس خطاب کے دو اجزا ہیں حاذق الملک۔ تو اہل خاں صاحب کا یہ کہنا کہ میں نے حذاقت واپس کر دیا ایک اہل سی بات ہے وہ حاذق طیب اب بھی ہیں۔ رہا دوسرے ٹکڑے یعنی ملک کے واپس کرنے کا اعلان تو ملک پاس تھا ہی کب جو واپس کر دیا۔

اجی صاحب بات یہ ہے کہ گورنمنٹ سے مقابلے کی مجھ میں جان نہیں ہے میں بنش خوار ضرور ہوں مگر آلہ سرکار نہیں ہوں اس کو میں نے صاف ظاہر کر دیا ہے۔ شاگرد ڈارون تو خدا ہی نے کر دیا۔ اکبر مگر نہیں ہے مداری کے ہاتھ میں آج کل اللہ اللہ کرنے والے مسلمانوں کی جان عجیب ضیق میں ہے وہ حکومت کے شہداء کا مقابلہ کریں یا مغرب زدہ لوگوں کے عقائد کا۔ اقبال صاحب نے حافظ اور نصرت کے خلاف ایک علیحدہ مورچہ قائم کیا ہے میں نے انھیں خیالات سے متاثر ہو کر کہا ہے۔

لیڈر کو دیکھتا ہوں نصرت پرمعترض کالج کے کیڑے پڑ گئے دلی فقیر میں
تمہاری شاعری پھل بھری ہے یا پڑا خا ہے یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کا سادہا قاتل
منہا ہی ہوتا جی بنارس میں فائے کر کے مخالفین کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ
لہ کا سادہا کا معنی چمکتا پیالہ۔ کلام پاک کا ٹکڑا ہے۔

ان کی بات مانی جائے تو صاحبِ پیشا کرنے سے نہ کسی کو آج تک سوراج ملا ہے نہ ملے۔ یہ کہہ کر کہ ”ہم مر جاب ہم جیو دیب“ حکومت کو کیا ڈرا سکتے ہیں۔ اچی ۵
یا فلسفہ ہر تیغ کا یا ہر سکوت کا باقی جو ہے وہ تار ہر سب عنکبوت کا

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہر تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ
زور بازو نہیں تو کیا اسبجج ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ
میں نے اس موقع پر کہا ہے ۵
یہ دال لب لنگ (نارس تو اب گل نہیں سکتی کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی
۵ / مئی ۱۹۲۲ء

فرمایا اس شعر میں حسن التعلیل کا لطف دیکھیے ۵
تا بہ سینہ گردنیں جھکنے لگیں تسلیم کو درد اٹھتا ہے خیال یا ر کی تعظیم کو
فرمایا: میں نے آپ کو اپنی وہ نظم اب تک نہیں سنا جیو جرنی کی جانب سے بلیم
پرفوج کشی پر لکھی ہے اب اس وقت یہاں موجود نہیں ہے پھر کسی دوسرے موقع پر
سناؤں گا۔ درد کے اٹھنے پر اس کے ایک شعر کا خیال آیا۔ گولہ باری سے بلیم کی
حالت دکھائی ہے ۵ غ
کس کی طاقت تھی کہ گولوں کی نہ عزت کرتا گردن کر صفِ ہستی سے بیا باں اٹھا
میں نے عرض کیا: میرا ایک شعر ہے
اک دل سبب ننگ ہے اس بزم کی شرکت جزدرد کوئی واں تری آمد یہ اٹھا بھی

لے سنا ہے کہ حال میں مولنی سے اس کے ایک دوست نے کہا: آپ کی ہر تحریک ایسی دزدنی ہوتی
ہے کہ بغیر کامیاب ہوئے نہیں رہتی اس نے جواب دیا میرے اٹے ہاتھ کے پڑے تحریک میں
دزدن اس ڈنڈے کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے جو میرے سیدھے ہاتھ میں رہا کرتا ہے۔

اور مومن خاں نے غضب ہی کیا ہے کہتے ہیں یہ
 محفل میں میرے ذکر کے آنے ہی اُٹھ رہے بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو
 سید صاحب کسی کے شعر کو کم خیال میں لانے والے تھے اس شعر کی بے اختیار
 تعریف کی۔ میں نے عرض کیا آپ کا یہ شعر بھی خوب ہے
 مجلس نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو
 نوٹ بک دیکھ کر چٹیاں مٹاتی ہے غ

جمن کے سر پر ہند کا غلہ سوار ہے مخفی ہے انجمن میں مگر آشکار ہے
 میں نے کہا میں نہیں سمجھا۔ فرمایا جمن کے سر پر ”ان“ یعنی غلہ لگا دو تو انجمن
 ہو جاتا ہے میں نے عرض کیا اس قسم کی سطحی طفلانہ کوششوں کو کلام سے نکال
 ڈالیے۔ آپ کے سخن کی عظمت و عمق پر حرف لاتی ہیں۔ فرمایا خیر یہ آپ کو بند
 نہیں تو دوسری چٹیاں مٹیں گے

مکن نہیں عبور مرے اُن کے راز پر بالفعل ہے مقامِ عدالت جہاز پر
 میرے سکوت پر فرمایا آپ نے غور نہیں کیا اس کا حل Courtship
 ہے۔ میں نے عرض کیا میرے نزدیک یہ بھی بہت دُور از کار اور طفلانہ ہے
 فرمایا اچھا سہل مئے دیکھیے
 مرجائیں گے پر رکھیں گے ثابت قدم اپنا ہے مرد میں جو دال کبھی گل نہیں سکتی

لیڈی تو ہے شوخ شرگیں ہے بانو غ بایں ہر وقت یہ ہے وہ بانو
 (no) (yes)

برہن دل میں اگر رام سے کہتا ہے کہ آ بات یہ خوب ہے اک صورتِ آرام تو ہے
 ۲۷ مئی ۱۹۲۰ء

شہر کے عالم مولانا محمد کافی صاحب نے اپنے مدرسہ کے ایک طالب علم حافظ عبدالمجود صاحب سے کہہ دیا تھا۔ وہ عشرت منزل میں اگر نماز (یا مخصوص مغرب کی) پڑھایا کرتے تھے۔ آج سید صاحب نے اپنی سبحان اللہ والی غزل اُن سے خوش الکافی سے پڑھ کر سنوائی۔ اس کے بعد حسب ذیل اشعار خود سنائے غزلیہ بحثوں میں الجھنا ہر دلیلوں میں نہ گھنسا ہر زبان عجز ہی اور لذت اسلمے حتیٰ ہر فرمایا: ہم لوگوں کے منہ سے اگر کوئی بات منافی ادب نکل بھی جاتی ہے تو اعتراف عجز و انفعال کے ساتھ یہ غ

میں چاہتا تھا کہ ہستی سے کروں قطع نظر نہ ہو سکا مگر ایسا، خدا کو کیا کرنا

قابل قدر طبیعت ہی ہماری اکبر ہیں مصیبت میں اور اللہ سے خوش رہتے ہیں

حالت اکبر کو دیکھ اللہ سے امید رکھ اس قدر مقبول اور ایسا گہکار آدمی فرمایا دیکھنا آدمی والی غزل میں مطلع کیا بے تکلف آیا ہے غ فرمایا آج میں نے ان کے گھر بھیجا کئی بار آدمی جب سنا تو یہ سنا بیٹھے ہیں دوچار آدمی ۱۲ جون ۱۹۲۷ء

فرمایا ”ہر کہ شمشیر زند خطبہ بہ نامش خواند“ سلطنت بغیر کافی جان و مال قربان کیے نہیں ملتا کرتی کسی کا ”صاحب“ سے غلامانہ عاجزی کے ساتھ یہ کہنا کہ حضور مجھے بادشاہ سمجھا کریں اپنی عقل اور اپنی قوم کی ہوا خیزی کرانا ہی بتیہاگر سے دینی مدارج مل جائیں تو مل جائیں سلطنت نہیں مل سکتی بالخصوص اس حالت میں کہ اب خود جہا تاجی کے جتنے میں تفریق ڈال دی گئی ہے اور انھیں کے آدمیان سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں یہ غ

ہمارے ملک میں یہ زور اقبال فرمائی ہو کہ کن کو آپریشن میں بھی باہم خانہ جنگی ہو

مناہر کہ ہانا گاندھی کے خاص خاص دوست بھی مالی فوائد کے مد نظر حکومت کی
ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں میں نے اسی کا احساس کر کے کہا ہے کہ اس طرف حکومت

کی سختی اور اس طرف آپس میں پھوٹ سے منع
سینہ گاندھی میں سائنس غائب کرنے لگیں لکھنئی بائی فرنگی کی طرف جھکنے لگیں
حکومت کو متاثر اس وقت کیا جاسکتا ہے جب آپس کے اختلافات دور ہوں سے منع
ہر ایک کا جہاں میں ارمان نکل رہا ہے تو یہ بھی چل رہی ہیں جو تا بھی چل رہا ہے
۵ مار جولائی ۱۹۲۷ء

فرمایا دیکھو میں نے اس مغربی تہذیب پر طعن کی ہے کہ جو تار تار جاتے
ہیں اور I beg your pardon معافی چاہتا ہوں اپنے الفاظ

دلیں لیتا ہوں کہ اگر بری الذمہ ہوتے جاتے ہیں سے منع
کی تھی باپوش زنی جب ہوئی نالش دائر کہ دیا صلح کرو لیتا ہوں جو تا واپس
واپس گو تھی زبانی ہوئی نالش ڈیس ہو گیا کورٹ سے وہ شوخ اچھوتا واپس
میں نے کہا میں اس شخص کی شوخی سے زیادہ آپ کی شوخی دیکھ رہا ہوں کہ مارا
ہوا جو تا پھر واپس دلار ہے ہیں کہ دو بارہ سر کو بی کے کام آئے سن کر مسر
ہوئے فرمایا دوسری اقوام کے مذہبی و مدنی اختلافات ایک طرف خود مسلمانوں
میں شیعہ، ہستی، وہابی، بدعتی، بریلوی، دیوبندی جھگڑے کیا کم ہیں جو سب کو
متحد ہونے دیں میں نے اس پر کہا ہے سے منع

اختلافوں کے پیتا ہیں جو سماں اتنے متفق ہو نہیں سکتے ہیں مسلمان اتنے
حکم صاحب نے دیا ہے کہ شہزاد نہ کرو خبر اتنی ہے اور اخبار کے سماں اتنے
میں نے آتی اور اتنے کی بلاغت کی داد دی فرمایا کمزوری کے باعث روزہ
نہ رکھ سکا اس کی معذرت منو سے منع

رمضان میں جو رہا صوم سے محروم اکبر
 سنے اس کے بھی حلو اہر مگر عید نہیں
 الہ آباد کے محلہ دائرہ شاہ اجل کے مولانا محمد فاخر صاحب کو اُن کی بے لوث دینی
 وقومی خدمت کی دادیوں دیتا ہوں ۷ غ
 فاخر مثلثوں (اہلِ مثلث) سے سازش نہیں کرے گا

مرکز ہر دائرے کا جنبش نہیں کرے گا
 دکھو انگریزی قوانین میں کیا بے تکلف شعر نکلا ہے ۷ غ
 بات کچھ ہو ہی گی لائڈ جابج میں آج کل دنیا ہر ان کے چابج میں
 ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء

فارسی شعر سنایا ۷ غ
 زمینت قصر نہ خواہد دل حسرت زد گال شجرے باشد و پائین مزارے باشد
 میں نے تعریف کی فرمایا: اپنے افغان شہزادوں کو بھی سنا وہ بہت پسند
 کریں گے۔ دکھو آج پیری میں یہ خیال ہرادر کل جوانی میں یہ تھا ۷ غ
 نیچر کو ہوئی خواہش زن کی اور نفس نے چاہا رشک پری

شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زانی ہی سہی
 ممکن نہیں ایسے ترا نوٹس نہ لیا جائے گال ایسے پری زاد ہوں اور کس لیا جائے
 میں نے عرض کیا کہ میں نے اس نوٹس لینے سے نظر کو یوں روکا ہے ۷ غ

حسنِ سربازار کو کیا دیکھ رہا ہے غافل تیری نظروں کو خدا دیکھ رہا ہے
 ایک دوسری جگہ نوٹس نہ لینے کو یوں عرض کیا ہے ۷ غ
 ناز ہر دل کو کہ نظارہ سے آنکھیں پھیریں اُس نظر کو دیکھے جس نے کہ دیکھا بھی نہ ہو
 فرمایا: اس کے برعکس مضمون مضمون ۷ غ

جلوہ ساتی و می جان لیے لیتے ہیں شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیسے لیتے ہیں

میں نے عرض کیا کہ میں نے اس مضمون کو بھی ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔
 سرمستی شباب میں ہوتا ہے غم و رعب اب بھی کرین عیش تو بتلاؤ اور کب
 فرمایا جوانی و پیری کا تقاضا ایک شعر میں دکھو۔
 جوانی نے تو اپنے واسطے ہم کو اٹھایا تھا بڑھاپا تو بٹھائے اب خدا کے واسطے ہم کو
 میں نے داد دی کہ کیا پاکیزہ نشست و برخاست ہے لیکن طفلی جوانی اور پیری تینوں
 حالتوں پر میرے ربوہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔
 وطن میں آج اگرچہ عبرت خوب روتی ہے یہ گلیاں مہ ہیں طفلی و جوانی جن میں کھوئی ہے

بشر کی غفلت و راحت پہ پیری آکے روتی ہے یہ دو مرقہ ہیں طفلی و جوانی جن میں سوتی ہے

خیال کا مرانی حیات دہر پر تفس ہے جوانی جہل ہے طفلی خطا پیری تاسف ہے
 فرمایا آج میں نواب احمد صاحب پروفیسر بڑودہ کلج کے اس شعر کا دیر تک مزہ
 لیتا رہا۔

اُترے ہیں جوز میں پر روشن دماغ کے کر وہ مجھ کو ڈھونڈتے ہیں دل کا چراغ کے
 ۲۸ جولائی ۱۹۲۰ء

یاد آہی کے سلسلہ میں فرمایا ہائے کیا لوگ گزر گئے کہ دنیا میں تھے
 مگر دنیا سے بالکل بے خبر میرے ایک خوش لیاقت دوست تھے شعرو سخن کا بھی
 ذوق رکھتے تھے جب ملکہ و کٹوئیہ کا انتقال ہوا تو حکام رس لوگوں نے انگریزی
 عہدہ داروں کے سامنے نوچے پڑھے قصائد پیش کیے، تعزیتی مظاہرے کیے۔
 ایک دفعہ مجھے میرے یہ دوست ملے۔ میں نے کہا آپ نے کلکٹر صاحب کے
 سامنے کوئی تعزیتی قصیدہ پیش نہیں کیا؟ چچا: کس بات پر؟ میں نے کہا ملکہ معظمہ
 کی وفات پر اتنا سن کر تعجب سے چونک پڑے بولے: ارے کیا ملکہ دسٹوریہ

مر گئیں؟ میں نے کہا اللہ اللہ ہفتوں سے ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا ہے اور آپ کو اس کا علم تک نہیں دیکھے ان خیالات کو میں نے اس شعر میں یوں زبان دی ہے جو صرف عشقِ ذہنی قوتیں ہیں جسے غافل غ سبھا کی ہیں جو پر یاں اکثر اپنے گھر نہیں آتیں میں نے تعریف کی کہ کیسی سامنے کی باتوں سے آپ نے کیسے دقیق معانی سمجھا دیے حقیقت یہ ہے کہ ”کنا اس کو کہتے ہیں“ میرے دادا مولوی عزیز الدین صاحب رئیس بدایوں جب پہلی بھیت میں منصف تھے تو ان کی محویت اور ذہنی قوتوں کی تن سے غفلت کا ایک واقعہ بریلی کے رئیس مولوی محمد خلیل صاحب بیان فرماتے تھے۔ کہتے تھے کہ آپ کے دادا سے میرے والد صاحب کے گہرے مراسم تھے میں بریلی جاتے وقت چند گھنٹوں کے لیے پہلی بھیت میں ٹھہر منصف صاحب کے یہاں پہنچا، دسترخوان پر بیٹھے تھے اُسی وقت کھانا ختم کر چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر بونے ارے خلیل تو گب آیا آکھانا کھائے۔ میں بیٹھ گیا۔ دسترخوان پر صرف کچھڑی تھی منہ میں نوالہ دیا حلق سے نہ اُتر سکا کچھڑی بالکل بھیک کی تھی۔ مجھے مشکلف کرتے دیکھا تو دریافت فرمایا کیوں کھانا کیوں نہیں کیا کھا کر آیا ہے۔ میں نے کہا کچھڑی بالکل بے نمک کی ہے اتنا سن کر عظیم کو آواز دی وہ آیا۔ پوچھا کیا آج کچھڑی میں نمک نہیں ڈالا ہٹا کا کہتا ہے بالکل بے نمک کی ہے عظیم نے کچھڑی چکھی او کہا: ہاں حضور آج نمک ڈالنا بھول گیا۔ فرمایا: جاؤ اس بچے کو کچھ اچار وغیرہ لا کر دو جب ہی اس کے منہ میں نہیں چلتی حالانکہ خود وہی کچھڑی پیٹ بھر کر کھا چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ

جو صرف عشقِ ذہنی قوتیں ہیں تن سے ہیں غافل

سبھا کی ہیں جو پر یاں اکثر اپنے گھر نہیں آتیں

فرمایا دیکھو حضرت منصور کی defence (دربت) میں یہ شعر منسوخ

باطل کا جمال آئے بھی نظر اور از در فلک ہر نبی ہو آسان نہیں ہوا اکبر عاشق بھی بنے کافر نبی ہو

۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء

ایک دن قبل مجھ کو اور چودھری رحم علی صاحب سب اڈیٹر انڈینٹ کو اطلاع کرائی تھی کہ ہم لوگ ۳۰ جولائی کی شام کو آئیں۔

”ذوقی شاہ صاحب آرہے ہیں اُن کی وجہ سے سماع کا انتظام کیا گیا ہے اور کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں۔“ میں حسب عادت مغرب سے قبل کھانا کھا کر پہنچا۔

چودھری رحم علی صاحب موجود تھے۔ معلوم ہوا ذوقی شاہ صاحب کی اطلاع آگئی وہ نہیں آرہے ہیں، اس لیے سماع نہیں ہوگا۔ میں نے چودھری رحم

صاحب سے آہستہ سے پوچھا آپ کھانا کھا کر آئے ہیں۔ بولے نہیں میں نے کہا آنکھوں میں آگئی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہا ہوں کسی کی نگاہ میں

میرا خیال ہے کہ دعوت سماع و طعام ذوقی شاہ صاحب کے سلسلہ میں تھی جب گانا نہیں تو کھانا کیسا یہاں نری دعوت اشعار معلوم ہوتی ہے۔ ع

بہر مرض کہ بنالہ کے شراب بہند

میں تو کھانا کھا کر آیا ہوں اور ابھی بیٹھوں گا آپ باتوں باتوں میں منشا لے لیجے اور جلد اٹھ جائیے کہ گھر کا دروازہ بھی بند نہ ملے یہی ہوا کہ اُنھوں نے اجازت چاہی تو فرمایا ابھی بیٹھے کچھ اشعار سن کر جائیے۔ غرض کہ چند اشعار سنائے جب یہ شعر نایا ہے

اب اپنے دل کو بجز غم کے کوئی راہ نہیں خدا کا شکر یہی ہے کہ غم گناہ نہیں تو میں نے کہا آپ نے شکر کے واسطے کیا پاکیزہ پہلو تلاش کیا ہے میں اس سے پہلے شکر و شکوہ کے واسطے آپ کے اس انتخاب کا قائل تھا کہ

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہر گرم لیکن میرے دل سے یہ صدا آتی ہے

کھلتا نہیں رازدہر شکوہ ہو تو یہ اور شکریہ ہو کہ موت آجانی ہو
لیکن غم گناہ نہیں والا پہلو اس سے زیادہ قابل داد ہو
۱۱ اگست ۱۹۲۰ء

مید صاحب سے ایک پڑوسی سے ایک مکان کے بارے میں کچھ
مقدمہ بازی ہو رہی تھی اس سلسلے میں میرے مکان پر کڑے میں تشریف
لائے اور جناب والد صاحب سے فرمایا کہ بالودوار کا پرشاد صاحب منصرم
جی سے سفارش فرما کر مقدمے کا اجلاس تبدیل کرادیں۔ ملازم سلیمان ساتھ
تھا والد صاحب نے مشرت پیش کیا سلیمان کو بھی دیا وہ ہچکچا نے لگا اس کے
تائل کو دیکھ کر مید صاحب نے فرمایا: سلیمان لے لو وہیں تخت پر بیٹھ کر پیلو تخت
اور سلیمان کے تسلسل نے ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب کا خیال دلایا۔ والد صاحب
سے فرمانے لگے: ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب ایک قابل شخص ہیں بہت اچھا ہوا
کہ ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ تھوڑی دیر تائل کرنے کے بعد فرمایا دیکھو کیا اچھا
مصرع آیا ہو۔ ع۔ غ۔

بیچ ہائی کورٹ اب تخت سلیمان ہو گیا

میرے تایا مولوی و ہاب الدین صاحب نے دوسری باتوں میں لگا لیا دوسرا
مصرع نہ ہو سکا۔

۲۷ اگست ۱۹۲۰ء

فرمایا: لوگ کہتے ہیں کہ میں حکومت کے لایچ یا خوف سے خاموش
ہو گیا ہوں اور ملک کو آزادی دلانے میں حسب توقع حصہ نہیں لیتا۔ جب
میرا یقین ہو کہ حکومت سے کھل کر لڑنا مضر ہو تو بھلا میں کیا کہوں اور میرے
کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہو۔ میں نے اسی خیال کو نظم کیا ہو۔

مے خار کوئی گل تو میں بے شک لکھڑوں بگڑی ہوئی ہوا ہو تو موسم سے کیا لڑوں

ہم اس زمانے میں سہتیں اپنے گھر میں پرے ہوا بھی بدلی ہوئی ہر فلک سے کون لڑے

ہر جہجہم سے برسرِ کیں غور کیا کریں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے اور کیا کریں
میں سن کر خاموش بیٹھا رہا اس پر فرمایا آپ نے توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا ہاں،
یہ آخری شعر شاعرانہ نقطہ نظر سے اچھا ہے مگر فلسفہ کے لحاظ سے اس نے مجھے
متاثر نہیں کیا اہل تصوف پر بڑا الزام آج کل یہی ہے کہ یہ لوگ اپنی تعلیم سے قوم
کے قوائے عمل کو مضل کر رہے ہیں۔ انھیں اپنی ”تعلیم کی فکر ہے“ غرق کی
نہیں انھیں سر جھکائے بیٹھا رہنا اور ذلتوں پر صبر کی ہدایتیں کرتے رہنا آتا ہے
اس کے برخلاف مجھے آپ کی یہ تعلیم پسند ہے

میں نام سنی کا اپنی خدانہ رکھوں گا جو بن پڑے گی مگر وہ اٹھانہ رکھوں گا
مسکرا کر فرمایا: اچھا اپنے مذاق کا ایک دوسرا شعر سنو میں نے راہ سنی و عمل میں
بیٹھ جانے والوں کی مایوسی اور پست ہمتی دہر کر کے لیے کہا ہے
جو تھک کر بیٹھ جاتا ہوں زمیں کہتی ہے یہ مجھ سے

ترے رکنے سے کیا ہوتا ہے تم چلتے ہی رہتے ہیں

اس شعر کی میں نے بہت تعریف کی اور عرض کیا کہ جنگ اُحد میں ایک صحابی
ابن نصر نے ایسا کر کے دکھا دیا جب حضور سرور کائنات کے شہید ہو جانے
کی غلط خبر مشہور ہوئی تو حضرت عمر فاروقؓ مایوس ہو کر بیٹھ گئے ابن نصر نے ان
سے بیٹھ جانے کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا: جب آل حضرتؓ ہی نہ رہے تو لڑیں
کس کے واسطے ابن نصر نے جواب میں فرمایا کہ اس خبر نے آپ کو پست ہمت
کر کے بٹھا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ جب آل حضرتؓ ہی نہیں رہے تو ہم جیسا کس

کے واسطے یہ کہ کرتلوار لے کر پھر دشمنوں میں گھس گئے۔ یتر زخم کھا کر جام شہادت پیا۔ تمام جسم قیہ ہو گیا تھا۔ صورت پہچانی نہیں جاتی تھی کہ یہ لاش ہو کس کی ایک انگلی کے نشان سے بہن نے پہچان کر بتایا کہ میرے بھائی ابن نصرؒ ہیں۔ ہم نے جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے لٹھے جان دی آپ کے دروازہ پر کے لٹھے یہ سن کر سید صاحب نے فرمایا: انا شاء اللہ آپ کی طبیعت میں بہت سوز بھرا آپ کس کے مرید ہیں؟ میں نے کہا: کسی کا نہیں۔ فرمایا: تو کسی سلسلے میں داخل ہو کر قلب میں جلا پیدا کر لیجئے۔

اعتبار اُن کا کہ اگر جو ہیں پابند نماز ہیں ہی لوگ کہ جو وقت پہ کام آتے ہیں پچھلی مرتبہ میں نے دہلی جا کر خواجہ حب کی شب بیداری، اُن کی عبادت اور اُن کے حسن سلوک کو خود دیکھا۔ مریدوں سے جو نذر وغیرہ کی آمدنی ہوتی ہو کر اس کا بڑا حصہ حاجتمندوں، مسافروں، رشتہ داروں اور دوستوں کی خدمت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اکثر لوگ اُن کی کثیر آمدنی کو دیکھ کر جلتے ہیں۔ یہ جلتے والے بیشتر بڑھے لگھے اور بالخصوص تعلیمات کے لوگ ہیں۔ میں نے اسی کو محسوس کر کے کہا ہوں۔

جناب خود تو فقط فیس ہی سے پلتے ہیں مرید نذر جو دیں پیر کو تو جلتے ہیں خواجہ صاحب کو خداجن افراط سے دیتا ہو وہ اُسی سیر حشی سے صرف کر دیتے ہیں۔ میں نو مہر میں دہلی گیا تھا تو اپنے خیال کے موافق کافی اورٹھنے بھجانے کا سامان لے گیا تھا لیکن دہلی کی سردی کے لیے وہ کافی نہ ہوا تو خواجہ صاحب نے ایک کاف نہ صرف مجھے بلکہ میرے ملازم سلیمان کے واسطے بھی تیار کر دیا۔ الہ آباد میں خود خواجہ صاحب کے مرید سیکڑوں کی تعداد میں ہیں مگر میں ایک بزرگ کا دست گرفتہ نہ ہوتا تو اس پیری میں مریدی خواجہ صاحب ہی کی کرتا۔

فقیروں ہی کی سبھا سبھا ہی جو مستند ہی ہیں جتھا ہی
 ہمارے صوفی کا رنگ اچھا کہ وجد ہو اور برہم کتھا ہو
 اگر آپ خواجہ صاحب کے مرید ہو جائیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ
 وہ یہاں کی خلافت کا مستحق آپ ہی کو قرار دیں گے اور تمام مقامی مریدین کے
 سرگروہ آپ ہی ہوں گے یوں تو ہندوستان میں بہت سے صاحبان عرفان
 ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب میں میں نے کچھ اور ہی چیز محسوس کی ہے
 وہ کم ہیں تڑپنے میں جنھیں ملتی ہے لذت یوں آپ کی نشیتر کے بسمل تو بہت ہیں
 یہ اشعار میں نے خواجہ صاحب ہی کے لیے کہے ہیں
 حق نظامی کو میں نے دیکھا شریف خصلت فقیر طینت

عمل ہوا اپنے ہی عضروں میں اگرچہ دہلی کی ہر ذہانت
 عنان اندیشہ ہائے مضطر ادھر ادھر کو کبھی ٹری بھی
 وہ دست دل ہو کہ جس سے چھوٹی کبھی نہ جل المتین وحدت
 خیر میں اُن کے ہر تصوف معاشرت میں ہیں بے تکلف

فروع جو کچھ بھی پیش آئیں اصول میں اُن کے ہر قناعت
 محسوس خواجہ صاحب کے متعلق مشہور کرتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کے ایجنٹ ہیں۔
 لیکن پچھلی مرتبہ اُنھوں نے سندھ کے ایک پیر کو گرفتار کرنے پر گورنمنٹ کو ایک
 جھٹی بھجی تھی اس سے لوگوں کو اُن کی طرف سے بدگمانی دُور کرنی پڑی۔ میں
 نے پوچھا جھٹی میں کیا لکھا تھا؟ فرمایا وہ تو شائع ہو چکی ہے آپ کی نظر سے نہیں گزری؟
 خواجہ صاحب نے لکھا تھا۔ اب تک آپ پولیٹیکل لیڈروں کے خلاف تھے
 لیکن اب آپ نے درویشوں پر بھی ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے تاریخ شاہ
 ہر کہ فقیروں سے اُلجھ کر بڑی بڑی سلطنتیں اُلٹ گئی ہیں۔ یہ اقدام آپ کی

سلطنت کے زوال کا پیش خیمہ ہے۔ غرض کہ بہت سخت لکھا ہے بیعت کے متعلق آپ غور کر لیجیے۔ خواجہ صاحب یہاں آنے والے ہیں آپ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیجیے۔ میں نے عرض کیا: میرا خیال ابھی تو کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا نہیں ہے اور جب ہوگا تو خواہ کوئی بزرگ ہوں اس خیال سے ہرگز نہ ہوگا کہ میں خلیفہ اور سرگرم وہ جماعت بنایا جاؤں۔

۴ ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمایا: بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ میں باز دید کی ملاقات کو نہیں جاتا۔ میں نے اپنی کمزوری کو پیش کر کے ان سے یوں معذرت کی ہے کہ خلق مجھ سے طالب پابندی اخلاق ہے میری یہ حالت کہ مجھ پر تھینک یو بھٹائی ہے فرمایا مولانا محمد کافی صاحب فرماتے تھے کہ ایک مغرب زدہ بیرسٹر صاحب اُن سے اُلجھ پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمائیے ہمارے آپ کے خیال کا کہیں میل نہیں ہو سکتا اُنھوں نے کہا ہمارا آپ کا مرکز اتصال خیال ایک مقام ہے وہاں میل ہو سکتا ہے پوچھا کہاں فرمایا قبرستان مولانا صاحب کے اس جواب نے مجھ سے یہ شعر کہلوایا ہے

اسٹیشن فن کی بھی کیا خوب ریل ہے اس راہ میں ہر ایک پنجر کا میل ہے

۲۳ ستمبر ۱۹۲۲ء

فرمایا دیکھو کسی ایرانی نے کیا خوب کہا ہے کہ
مباش اے لہ نور و عشق غافل از طینہا کہ در آخر بجائے می رسد از خود رمیدہا
میں نے اس شعر پر اپنا ایک شعر چہم پہنچا کر اُس کو آج کل کے سیاہی رنگ میں یوں رنگا ہے غ

جو پوچھا کیوں کر اس منزل تارنیک میں باز می
زبان حضرت شوکت سے بوسے باز تر کاغذ

مباش اسے لودِ عشقِ غافل از طہید نہا کہ در آخر بجائے می رسد از خود ر میڈ نہا
فرمایا چونکہ یہ فارسی کا شعر تھا اور ہاتھ تاجی سے کہلوانا تھا اس لیے زبانِ حضرت نکست
کا اہتمام کیا گیا۔ فرمایا ملک کی فلاح اور رستگاری کے لیے کون کوشاں نہیں ہو
لیکن آج کل سب سے زیادہ ساعی جو ہستی ہو وہ گاندھی جی کی ہو۔ گاندھی جی چونکہ

نیا ہیں (لالہ) اس لیے میں نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے۔

یوں تو میں جتنے شگوفے سب کو فکرِ باغ ہو یہ مگر بیج ہو کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہو
میں نے عرض کیا کہ ایک لفظ لالہ سے آپ نے شعر کے مضمون کو کہاں سے کہاں
پہنچا دیا۔ یہ شعر آپ کے کمالِ فن کی کھلی ہوئی شہادت ہو فرمایا گاندھی کے متعلق
چیتاں کے طور پر ایک خیال آیا ہو دوسرا مصرع ابھی نہیں ہٹوا ہے۔ ع غ
گاندھی میں دھن بھی گھائے بھی گھی بھی دہی بھی ہو

گویا لفظ گاندھی میں جو حروف ہیں ان کو اگر مختلف صورتوں سے رکھیں تو
”دھن“ یعنی دولت بگائے گھی، دہی بن جاتے ہیں۔

فرمایا: ذومعنی لطف دیکھے ظاہری و معنوی خوبیاں کیسی یک جا ہوئی ہیں۔
پہنتی ہو اگر تو صرف پھلی کہنے کو تو جل بھی جال میں ہو

میں نے عرض کیا کہ یوں تو ہر شعر آپ کی ذہنی اولاد ہو اس میں سے آپ جس
کو چاہیں زیادہ عزیز رکھیں لیکن مجھ سے پوچھتے ہیں تو اس شعر کا ذومعنی لطف
اور اخلاقی اثر اسی غزل کے مطلع کی ذومعنی اور عرفانی رفت کو نہیں پہنچتا۔
کیا بات ترے جمال میں ہو ہر وقت زمانہ حال میں ہو

۴ اکتوبر ۱۹۲۲ء

فرمایا جوانی اور تندرستی ختم ہونے پر تو بڑے سے بڑے ملحد کو بھی
خدا یاد آجاتا ہو عالمِ شباب میں جتنی جلد طاعتِ رب کی طرف توجہ ہوا انسان

اُس کو اپنی خوش نصیبی اور منفعت سمجھے۔ ایک انگریز مجھ سے کہتا تھا کہ سید صاحب جوانی میں عبادت انسان کو بے کار اور بے گار نظر آتی ہے لیکن اس کا فائدہ وہ اس وقت دیکھتا ہے جب death bed (بستر مرگ) پر ہو اس وقت بہت سہارا محسوس کرتا ہے۔ میں نے سید صاحب سے عرض کیا کہ مسلمانوں کی بڑائی کا سبب ترک مذہب بتایا جاتا ہے اگر یہ سچ ہے تو اہل یورپ کو ہم سے زیادہ نکبت زدہ ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ تارک مذہب ہیں فرمایا آنحضرت صلعم کی تعلیم کے دو تاکید پہلو تھے (۱) خدا کو ایک مانو (۲) کسی غیر خدا کو معبود مت گردانو اہل یورپ تعلیم نمبر ۲ پر پورے طور پر عامل ہیں اور نمبر ۱ کے تارک یعنی اہل یورپ خدا کو خدا نہیں سمجھتے تو کسی دوسری قوت کے سامنے بھی گردن بندگی نہیں جھکاتے۔ مسلمانوں نے اس تعلیم کے دونوں اجزاء کو چھوڑ دیا ایک تو خدا کو خدائے واحد نہیں سمجھتے دوسرے غیر خدا کو اُس عقیدت سے پوجتے ہیں جو صرف خدا کے لیے زیبا تھی مسلمان خدا سے زیادہ کلکٹر سے ڈرتے ہیں اور خدا کے سامنے درخواست اٹھ پیش کرنے کے بجائے بڑے تعزیر پر عرضی باندھتے ہیں میں نے اسی پر کہا ہے غ

خدا کا اب صرف نام ہی ہے گزشتہ پیروں کے سر پر سہرا
 انہیں کی اب ہر طرف ہے پوجا وہ حی و قیوم بن رہے ہیں
 اہل یورپ ہم سے اچھے ہیں کہ اگر ان کے نزدیک خدا محض ایک لفظ ہے تو تصرفاً
 اولیا بھی ایک کہانی ہے
 عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیان غیر کیسا
 عدد کی قیمت بگڑ بھی جائے ہماری قیمت وہی رہے گی

فرمایا مسلمان مقامات مقدسہ کے واسطے جا کر لندن میں عاجزی کر رہے
ہیں میں نے اس پر کہا ہر سہ

انقلاب دس ہر عقل آج کل حیران ہو آستانِ مہر مومن خدا کی شان ہو
آج لوگوں نے جیل خانے جانا حق کے لیے نہیں فیض اور نود کے لیے اختیار کر لیا
ہو اس پر کہا ہر سہ غ

مل نہ سکتی مبری تو جیل ہی کو جیسے ناتواں ہیں ورنہ کوئی کھیل ہم بھی کھیلتے
یہی خیال کہ آج کل حاکم و محکوم کا مشغلہ کیا ہو اس طرح پھر ادا کیا ہر سہ غ
حکام ہیں خزانہ و توبہ و رفل کے ساتھ خدام ہیں شگوفہ ترکِ عمل کے ساتھ
بازو میں یاں نہ زور ٹکلی میں شوقِ شو ہم تو مشاعرے میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ
کیا تاؤں مٹن صاحب کے زمانے کی پریشانیوں کا ڈرا ہوا ہوں ورنہ جو کچھ کہتا
تھا خوب جی کھول کر کہتا مگر خیر سہ

میرے سکوت سے مجھے بے حس نہ جانے لفظوں ہی کی کمی ہی خیالات کی نہیں
ہندو مسلم اتحاد پر فرمایا کہ تمدن معاشرت زبان سب ایک کر لیں مگر میری سمجھ میں
نہیں آتا کہ عقائد میں یکسانیت کیوں کر ہوگی؟ جو گائے اُن کے لیے معبود و مانا
وہ ہمارے لیے لذیذ غذا جب معاملہ آکر اٹھتا ہو تو ہمیں اُجھٹا ہو اس خیال کو
نظم میں دیکھو سہ غ

ہر ایک کے سر پہ ملک کی مٹکی ہو ہر ایک براتِ ہندو مسلم کی
کیاں کرتے ہیں فیل مجھ پر محبتِ بقر ہاتھی تو نکل گئے ہیں دُم کی ہو
دیکھی یہ اڈنٹ کس کل بیٹھتا ہو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ غضب کرتے ہیں
فیل بقر۔ ہاتھی کا پرا نظم میں جایا تو اڈنٹ کو نثر میں بٹھایا ہو میری اس تنقید
پر خوش ہوئے۔

۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء

فرمایا عشرت منزل کی ایک زمانے سے مرمت نہیں ہوئی ہوا اب مجھ سے
 کچھ ہونہیں سکتا عشرت کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے
 سامان عیش کچھ نہ رہا اڑ رہی ہو خاک اس غم میں اپنی جان مگر کیوں کروٹ لگ
 میں نے توجہ کے کہ دیا اس سال جو تھا مٹی اگر نہیں نہ ہوا جس کم جہان پاک
 گھر کی حالت آئے دن بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور چہروں کے لیے راتے
 کھلتے جا رہے ہیں انہیں احساسات کے تحت میں نے کہا ہے
 جو ہر آرام وہ بستر تو درازہ شکستہ ہے مصیبت دیکھے نیند آ رہی ہے سو نہیں سکتا
 تھی شب تار کیٹ چر آئے جو کچھ تھا لے گئے کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

دیکھے رہتا ہے کب تک ملتوی یہ قصد حج گھر کی جانب سے تو اطمینان ہونے کا ہیں
 فرمایا دیکھو ملک و ملت پر فدا ہونے کی تعلیم یوں دیتا ہوں ہے
 جی کے مرنے میں کیا ہے ناز کی بات مر کے جینا ہے امتیاز کی بات
 چاہتی تھی زباں کرے تو صبح دل پکارا کہ ہے یہ راز کی بات
 میں نے عرض کیا کہ مولانا محمد علی صاحب نے اس راز کو فاش کر دیا ہے
 خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ہوس زلیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
 ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء

فرمایا سید علی صاحب دکیل شیعہ ہیں مگر جب سنیوں میں بیٹھے
 ہیں تو کہتے ہیں کہ میں شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ہوں مگر شیعہ نہیں ہوں،
 ماتم تبرزے، تعزیرے وغیرہ کو بے کار سمجھتا ہوں اُن کے اس اعلان سے میں
 نے سوچا کہ یہ شیعہ ہونے سے تو خود منکر ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سنی بھی

نہیں ہیں۔ ہوں نہ ہوں مونث و مذکر کے درمیان کی جنس خنثی ہیں دیکھیے میں نے
 اُن کی اس دورِ خنی بات پر کیا نوٹ کیا ہے؟ غ
 مذکر کے لیے ہی ہے مونث کے لیے سٹی ہے ^{she} مگر حضرت محنت ہیں نہ ہیوں میں شیوں میں
 میں نے عرض کیا کہ مقبول حسین صاحب ظریف لکھنوی کا مصرع ہے۔ ع

معشوق وہی ہے کہ جو ادہ بھی ہو نہ بھی
 فرمایا: بعض اہل تشیع کے تعصب کا یہ عالم ہے کہ کسی شخص کے کمال فن کا اعتراف
 کرتے ہیں۔ لیکن جب معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب کمال سُتی ہے تو وہی کمال اُن
 کی نظر میں عیب معلوم ہونے لگتا ہے میرے بعض عزیز مجھ سے محض اس لیے
 جلتے ہیں کہ میں سُتی ہوں میں نے اُن کے دل کے چور کو یوں پکڑا ہے کہ ع
 بولیں بیگم کرتی میں اکبر سے عقد سنتی ہوں لیکن کہ سُتی ہے مٹوا
 کہ دیا میں نے رہو تم منتظر ترک ہارے اور میں شیعہ ہوا
 اس پر ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی آبرورِ ترکی حکومت
 کے وقار سے بہت کچھ قائم ہو اور اس کے مٹتے ہی مسلمان آوارہ و منتشر ہو جائیں گے
 لیکن ترکوں کے ہارنے سے شیعہ ہو جانے کا کوئی جوڑ نہیں۔ مفتوح فاتح کا مذہب
 قبول کرنا ہے ترک شیعوں سے نہیں لڑ رہے ہیں عیسائیوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ اس
 پر میں نے معترض صاحب کو جواب دیا کہ آخری مصرع کو یوں کر دو۔ ع غ
 ترک ہارے اور میں عیسائی ہوا

اس میں اور بلاغت پیدا ہو گئی کہ بیگم کو عیسائیوں سے اتنا بر نہیں جتنا سُتیوں
 سے ہے اس لیے عیسائی ہو جانے کے بعد مجھے قبول کر لیں گی۔ فرمایا لوگ آج دین کو
 زیادہ تر سوسائٹی کی خاطر بدلتے ہیں ع
 کبھی اسلام لاتے تھے کہ یہودین خدا قائم اور اب مذہب بدلتے ہیں کہ وہ اپنا جھانم

فرمایا ”شیعہ ہوا“ کو ”عیسائی ہوا“ سے بدلنے پر خیال آیا میں نے کلکتہ دلی
مس گوہر کے لیے کہا تھا سہ

کون آرام سے دنیا میں ہو گوہر کے سوا سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہو شوہر کے سوا
اس پر ایک صاحب نے کہا کہ آپ کو واقعات کا علم نہیں اور آپ نے شعر لکھ دیا
گوہر اب بے شوہر کی مس نہیں ہو اس نے ایک ایرانی سے عقد کر لیا ہو میں نے
اُن سے کہا: تو بقول حضرت شیخ سعدی یہ تو بڑے رشک کی بات ہو سہ
ہرگز حسد نہ بردم بر منبے دماے لیکن برآں کہ دار داز دلبرے دماے
جب عقد ہو چکا ہو تو دو لٹاکے گھوڑے کے ساتھ میرا شہزیر خیال یوں چلے گا سہ
مرد خلیج فارس گیسو میں جس کے کالے گوہر نے آب اپنی کردی اُسے حوالے
اکبر کے اب یہ مصرع جس ٹھن میں چاہے گا ہرگز حسد نہ بردم بر منبے دماے
لیکن برآں کہ دار داز دلبرے دماے

فرمایا مجھے تصوف اپنے والد صاحب سے ملا اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ میری
طرح عشرت حین کی طبیعت میں بھی تصوف سے لگاؤ پیدا ہوتا جا رہا ہو میرے
ان دو اشعار کو بہت سراہ رہے تھے اور لطف اٹھا رہے تھے سہ
دنیا کے تغیر کا نہیں جس شیدائے تعالیٰ بارگاہی بردانہ کو مطلب شمع سے ہو کیا کام ہو گنگنٹھل سے

وہاں قالوٹی یہاں بت پرستی بھلا سوچ کہا کیا تھا کیسا کیسا
میں نے عرض کیا کہ اس دوسرے شعر کے مضمون کو میں نے بھی یوں ادا کیا ہو سہ
کل ہم نے عہد عشق بکریا توڑتے ہیں آج بیاض شراب سے پیمانہ زندگی
فرمایا: مسلمان اب تک اس خوابِ خرگوش میں تھے کہ اہل ہنود کے مقابلے میں ہم
میں عسکریت کے جوہر زیادہ ہیں لیکن کٹار پور میں اہل ہنود نے گائے ذبح کرنے

پر مسلمانوں کو ذبح کر کے رکھ دیا میں نے اسی سے متاثر ہو کر کہا ہر سوغ
خدا ہی ہر جو ان کے سینگ سے بچ جائیں بقرب عی
سا ہر آجلی ہیں اب گنہ ماتا بھی مستی پر

۶ ستمبر ۱۹۲۷ء

دوران سر کی کئی دن سے شکایت تھی میں نے آج جا کر مزاج پوچھا فرمایا
اب ہر باری ہی اکبر اپنا شغل زندگی جب فقط مزنا ہی باقی ہر تو اچھا کہوں ہوں

دنیا سے میں کیا لگاؤں دل اب آنکھیں چھپت سے لگی ہوئی ہیں
میں نے عرض کیا چھپت کے تسلسل خیال نے یاد دلایا آرزو لکھنوی کا شعر ہر
تھی شام سے صبح تک سوئے در اب چھپت سے نگاہ جا لگی ہر
فرمایا اس تنہائی اور اس معذوری میں سر بیع الاحاسی میرے لیے اور عذاب
جان ہو گئی ہر

خودی کے حس سے بھی ہوتا ہر انشا کہ کہاں رہوں کہ مجھے بھی میرا یہ دے چلے
فرمایا میں نے ریاض خیر آبادی کو جب اس زمین کا یہ شعر سنا یا
امید حور میں سلم تو ہو گیا ہوں خدا ہی ہر کہ جو مجھے یہ بچکانہ چلے
تو ریاض کہنے لگے کہ حقیقت یہ ہر کہ یہ ”بچکانہ چلے“ جیسی باتیں ہم سے بن نہیں
پڑتیں اس کے بعد سید صاحب نے فرمایا اہل عرفان کا مطمح نظر سیاسی و مادی
منفاد سے بہت بلند ہوتا ہر وہ اپنے نفس کے تزکیہ میں لگے رہتے ہیں اور
بندگان خدا کو اپنی دعا سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اہل یہ ہر کہ ان کو محویت سے
فرصت ہی نہیں ہوتی جو سیاسی کھیل کھیل میں نے عرض کیا میرا ایک شعر
ہر

اور منکر کشف کرامت دل تو منزلِ صدق میں آجی بظلالِ حقیقت پھر کرنا پہلے اک جامِ چڑھا تو سہی
 فرمایا: دیکھو اس قسم کے معترض کو میں نے یہ جواب دیا ہے غ
 نیتِ عشق اگر میں نے نہ باندھی ہوتی عقل میری بھی یہاں حامیِ گاندھی ہوتی
 شکریہ مجھ میں سائی نہیں یورپ کی ہوا در نہ وہ شمعِ بصیرت پہ اک آندھی ہوتی
 کانگریس کے دوش بدوش کھڑے نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے
 مدخلہ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گویوں میں

۸ دسمبر ۱۹۲۰ء

فرمایا ہم کو مشیت کی بہت سی باتیں بہ ظاہر جبر و ظلم نظر آتی ہیں مگر بندہ
 ہونے کی حیثیت سے ہم کو ایسا کہنے کا حق نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مولوی تولّا
 حسین صاحب کا ایک شعر سنئے
 وہ مختارِ عمل مجھ کو کریں تو اختیار اُن کا مری مجبوریاں تو یوں بھی ثابت ہیں کہ بندہ ہوں
 حضرت حافظ شیرازی نے اس مسئلہ کا آخری تصفیہ یہی کیا ہے
 گنہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ تو در طریقِ ادب کوشِ دگونا گاہِ من است
 فرمایا میں نے محمود اور کاسمہ حبیبی کے واقعہ کے ساتھ یہی شعر کل ایک صاحب
 کو سن کر اپنا یہ شعر پڑھا تھا

اگرچہ تلخ دیا جامِ عمر فانی کا مجھے محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا
 میں نے شعر کی تعریف کی کہ واقعی اوّل تو ہم کو عمر ہی کون سی ایسی طویل عطا
 ہوئی ہے اس میں بھی راحت مفقود پھر ماموں تولّا حسین صاحب کا شعر سنئے
 بیاض ہستی فانی سے گم ہے صفحہ حیات رسالہ مختصر سالائے میں وہ بھی درقِ نکلا
 فرمایا ماشاء اللہ آپ تو شعر کی گورنمنٹ ہیں اچھا اس مضمون پر اپنا ایک شعر اور
 مناتا ہوں اگر قانون کی طرح آپ کے یہاں پاس ہو جائے تو سمجھوں گا کہ واقعی اچھا ہے

غم میں بھی قانونِ قدرت سے میں کچھ بدظن نہیں
 جانتا ہوں یہ کہ میرا دوست ہو دشمن نہیں
 میں نے بہت داد دی اور عرض کیا کہ ایک ایرانی نے نعت کے اس شعر
 میں خدا کو رقیب گردانتے ہوئے دامنِ ادب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے
 دل از عشق محمد پیش دارم رقابت با خدائے خویش دارم
 کہتا ہے خدا بھی کسی غیر کا نہیں ہے میرا ہی ہے اس طرح آپ کا بھی ایمان ہے کہ دوست
 ہے دشمن نہیں وہاں سے اس شعر کی کافی داد نہیں دی جاسکتی ہے
 دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گنجینِ نگاہ تو ز داماں گلہ دارد

۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء

میر آغا صاحب افغانی نے اپنے ایک خط میں لاہور سے مجھے ایک شعر لکھا تھا
 چو خوں بہا طلبند از تو کشتگاں در شر تبسمے کن و بگزر کہ ایں ادا کافیت
 میں نے یہ شعر سید صاحب کو سنایا فرمایا کوئی خاص بات نہیں ہے شعر artificial
 (مصنوعی) ہے عاشق کو بامروت ہونا چاہیے شکایت کیسی۔ میں نے کہا شکایت بھی
 فطرت ہے مگر خیر آپ کو یہ رُخ پسند نہیں ہے کسی اور کا شعر ہے
 مروت کب تمہارا نام لینے لے گی محشر مگر اتنا تو کہ دوں گا اسی مجمع میں قاتل ہے
 فرمایا: اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ طالب اپنے مطلوب کو سزا دلانا چاہتا تھا۔ میں
 نے عرض کیا کہ طالب خود نہیں کہے گا جب اس سے دریافت کیا جائے گا
 تو اسے کہنا پڑے گا فرمایا مضمون شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا
 مولوی تولا حسین نے اسے ظاہر کر دیا ہے

تمہارے ظلم محشر پہ چھپا ہے کیا کہوں چپ ہو کہوں ہاں تم اگر کہ دو کہ دو میرے کہنے
 حضرت امیر خسرو نے تو وہاں کا تمام مقدمہ یہیں ترتیب دے لیا ہے فرماتے ہیں

بمختر کر ترا پسند خستہ را جرگشتی سرت گردم چه خواہی گفت نامن ہا گویم
 فرمایا: ماشاء اللہ آپ کو بے شمار اچھے اشعار ہر وقت یاد آجاتے ہیں آپ مضمون
 دار اشعار یک جا کر کے ایک کتاب کی شکل میں کیوں نہیں پیش کر دیتے خیر اس
 مضمون سے متعلق میرا تو ایمان یہ ہے کہ حشر جس کا نام ہے وہ عالم ہی دوسرا ہوگا
 حضرت امام حسین علیہ السلام یا سرمد جیسے آزار دیدہ خاصانِ خدا اپنا اپنا عرضی
 دعوئے ہاتھ میں لیے ہوئے حشر میں ہرگز نہیں دکھائی دیں گے۔ دیکھو میں نے
 اس خیال کو اور خیال کیا حقیقت کو اس طرح پیش کیا ہے

خاصانِ حق کو حشر میں کیسی شکایتیں عالم بدل گیا ہے وہ دنیا نہیں رہی
 ایسے ہوئے ہیں محو تماشائے روئے دوست دشمن سے انتقام کی پروا نہیں رہی
 میں نے تعریف کی فرمایا: دیکھو میں نے حکومت کی خوش اقبالی اور اہل ہند کی تباہی
 کا یوں نوٹو کھینچا ہے

ہر گنہ گنہ گن میں مصروف صبح و شام ہے اس طرح برباد کرنا آپ ہی کا کام ہے

معاذ اللہ کیا مجبوری تقدیر بسمل ہے تڑپنا سامنے قاتل کے گتائی میں داخل ہے

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شکستہ ہوتی ہیں وہ روز دہتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں مجھے حیرت تو اُن پر ہے جو اس مٹنے پر مکتے ہیں

۲۱ جنوری ۱۹۶۱ء

فرمایا عشرتِ طرے شیعہ گراہول میں رہتے ہیں مجھے بااوقات ان
 اثرات کو توڑنے کی فکر نہ تھی رہتی ہے میں نے کہا اب وہ بچ نہیں ہیں بچوں ولے
 ہیں۔ آپ ”دامنِ ترکمن ہشیار باش“ کب تک کہتے رہیں گے۔ فرمایا ”جو

بن پڑے گی مگر وہ اٹھانہ رکھوں گا۔ اُس دن میں نے ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب سے بھی کہا کہ عشرت کو اہل تشیع کے اثرات سے بچانے رہیے مگر انھوں نے دیکھ لانا جواب دیا کہ آپ یہی کلمات عشرت حسین کے ردِ برو مجھ سے فرمیں تو میں توجہ کے ساتھ تعمیل کروں گا۔ مختلف صاحبانِ عرفان مثلاً غفور شاہ صاحب، ذوقی شاہ صاحب، شاہ دلیگر صاحب، خواجہ جن نظامی صاحب کو عشرتِ منزل میں جمع کرنے کا میں نے سلسلہ اسی لیے ڈالا ہر اور قوالی کے جلسے کرتا رہتا ہوں کہ عشرت اس رنگ کو طبیعت میں بچتہ کر لیں یہ میں خوب جانتا ہوں کہ گرد و نواح کی قوت کچھ کم نہیں ہو ضررِ سنو سے

تازگی رنگ گلِ پژمرده میں ممکن نہیں کیا چلے بادِ صبا کی لطفِ شبنم کیا کرے مگر میں عشرت کو نخلِ پژمرده نہیں سمجھتا بہر حال مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کرتا ہوں نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ دیکھو اس غزل میں ”ہم“ کے قافیہ کو ردیف کے ساتھ کس ترتیب سے بٹھایا ہے

نیئویت پر کیا میں نے جو اظہارِ طال سن کے صاحب نے کہا سچ ہے مگر کم کیا کرے میں نے عرض کیا: یہ اس قسم کی ترکیب ہے کہ قصہ منصور بن کربول لٹھی وہ شیخ مس کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو بھانسی کیوں دیا فرمایا اشار اللہ خوب یاد رکھا۔

۲۳ جنوری ۱۳۹۲ء

آج شام کو قوالی کا جلسہ تھا میں جلسے سے پہلے حاضر ہوا۔ فرمایا قافیوں کی بے تکلفی دیکھیے یہ غ

دھڑکوں سے طبیعت بے کل ہر دل سینہ میں سہا جاتا ہے
تسکین دلیں دیتی ہیں گھبرانے کو وہم آجبا تا ہے

میں نے عرض کیا آپ توانی کو فرماتے ہیں۔ میں مطلب کا لطف اٹھا رہا ہوں کیا پاکیزہ Psycho analysis یہاں قلبی وارداتوں کو الفاظ سے ادا کر دینا معمولی بات نہیں ہے بقول آپ کے ”دل پر گزری ہوئی ہر اور کوئی بات نہیں“ فرمایا: دیکھو اس مضمون کو کہ اہل یورپ کی ثروت کا سبب ہم اور ہمارا ملک ہے ایک چیتاں کی شکل میں یوں ادا کیا ہے غ

پنسر بھی ہے تمھاری ہمارے اجڑے عیاں ہے صورت پرچے دف پوری میں ایک اور چیتاں دیکھیے غ

بکار دین ہم آمادہ دل پر جوش من باشد مسلمان می شوم مسلما چودر آغوش من باشد ”سلا“ کو ”من“ کے آغوش میں رکھیے تو ”مسلمان“ ہو جاتا ہے۔ فرمایا حکومت آگ کو آگ سے بجھانا چاہتی ہے اس غلط عمل پر اسے متنبہ کرتا ہوں غ

مفر فرمادیوں سے اپنے تم ہر گز نہ پاؤ گے اخیر میں تیز ہوگی آہ کو جستنا دباؤ گے فرمایا ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر کو حکومت نے چاشنی دے کر ایڈیٹری کا کام چھڑا دیا اور عہدہ دار بنا دیا اس پر حکومت کو مبارکباد دیتا ہوں غ

لیڈر بہ اب تو تنگ ہے وسعت پیں کی بھی خوش ہو جیے کہ آپ کے فقرہ میں آگیا ہائے غ

دل اپنا دوست ہو کر حب کا تار غلط ہے بھرن کی آنکھ کو میں کیا کہوں وہ تو عدد ہی ہے ۲۸ جنوری ۱۹۲۱ء

مولوی نور الحق صاحب جسٹس راز سے فرمانے لگے اب میں چراغ سمری ہوں عشرت کی فکر دامن دل کو اب بھی پکڑے ہوئے ہے ان کو کس کے سپرد کروں دینی جاہ کا خیال آتا ہے تو کہتا ہوں لاٹ صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دے جاؤں، دینی فوائد پر نظر جاتی ہے تو کہتا ہوں کہ آپ جیسے صاحبانِ عرفان

کے سپرد کر جاؤں۔

۱۲ فروری ۱۹۲۱ء

فرمایا سیاسی جدوجہد میں حصہ نہ لینے کی معذرت مینے منع

ہم سے تو امید اب ہر بے سود اب آپ ہی کیجیے اچھل کود
غ تیز اب میں ہم تو گل چلے ہیں ان کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں
لوگوں نے قومی خدمت کو تاشا بنا لیا ہے منع

مل نہ سکتی ممبری تو جیل ہی کو جھیلے ناتواں ہیں در نہ کوئی کھیل ہم بھی کھیلے

میں نے عرض کیا اس سے قبل بھی میں نے یہ شعر سنا تھا آپ نے اس میں خدم

قوم کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس کے برخلاف آپ نے خود ہی تعلیم دی ہے

بہتر سمجھے ہو تم جو خاموشی کو یہ بھی نہ کہو کہ خاموشی بہتر ہے

اگر آپ کے لیے خاموشی بہتر ہے چپ رہیے لیکن دوسروں کو کہنے او

کرنے سے کیوں روکتے ہیں اس پر میں نے دیکھا سید صاحب کچھ نادام سے

ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد فرمایا: ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے مضحکہ اڑایا ہے مگر صرف

اُن کا جو خواہش منو کے تحت پبلک پلیٹ فارم پر آتے ہیں لوگوں کا خیال

ہے کہ میں اپنی پنشن کے خیال سے قومی کام میں سامنے نہیں آیا۔ یہ غلط ہے

اگر آج میں روپیہ کی خاطر قوم کا کام کروں اور پوری قوت اس طرف

صرف کروں تو کیا مجھ کو پنشن سے زیادہ فائدہ نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ مجھے کاپر

کے واقعہ کے بعد کی کش مکش یاد ہے۔ میں دو باتوں سے گھبراتا ہوں

(۱) کانپور کی مسجد کا مشہور واقعہ ہے کہ اُس کے کچھ حصہ کے شہید کیے جانے کے سلسلہ

میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا بہت مسلمان گولیوں سے مارے گئے تھے۔ خواجہ حسن نظامی

صاحب عین ہنگامہ کے دن الہ آباد سے ہوئے کانپور پہنچے حکومت (باقی)

ایک تو عشرت کے مصیبت میں پڑنے سے دوسرے اس خیال سے کہ میں اس پیرانہ سالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مصائب اٹھا سکوں کاش آج میری جوانی کا زمانہ ہوتا اور مجھ میں جان ہوتی۔

فرمایا: دیکھو جوانی سے حن و عشق کا ایک مضمون یاد آیا ہے
 رادھ پیغام حسرت کا دھڑکن تقویٰ کی زلیخا کی نظر ہو اور یوسف کی جوانی ہو
 میں نے عرض کیا کہ زلیخا کی نظر سے مجھے زلیخا کی دست درازی یاد آئی ایک ایرانی اس حرکت پر عشق کو معذور سمجھتا ہو اور حضرت یوسف کو خطا وار ٹھہراتا ہو کہ زلیخا کا مقصد دامن پھاڑنا ہو گرنہ تھا اس نے تو صرف دامن پکڑا تھا حضرت یوسف نے جھٹکا کیوں دیا جو بھٹ گیا اور اس کا اتنا بڑا مقدمہ بنا کھتا ہو۔

درید دامن یوسف کشیدن دامن گنہ ز جانب سر بیخ زلیخا نیست
 فرمایا: میں اس وقت اگر علی طور پر قوم کا شریک نہیں ہوں تو دعا سے ہوں۔
 انجن ہو دل اور آہ ہوائی جہاز ہو ہم نے سمجھ لیا ہو خدا کا رسا ہو
 فرمایا اہل یورپ نے اخلاق کے تمام قدیم اصول الٹ کر رکھ دیے مثلاً تقویٰ

(نوٹ صفحہ ۱۶۳) کوئٹہ ہوا کہ مسجد کے واسطے آادہ فساد لوگوں میں اکبر بھی شریک ہیں اس شبہ میں اکبر کے اس شعر نے اور تقویت دی ہے غ

سنا یورپ میں ہر قاصد پیام جنگ لایا ہو بھدا اللہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہو
 سمجھایا گیا کہ خون شہیداں سے کانپور کے شہیدوں کی طرف اشارہ ہو اور اس پر شکر خدا اور اظہار مسرت کیا جا رہا ہو کہ حکومت برطانیہ یورپ میں جنگ کی پریشانیوں میں مبتلا ہوئی
 سرچیس ملٹن صاحب گورنر تھے انھوں نے اکبر کو سخت بکرا اخیر خدا خدا کر کے عافیت اور
 پیشن دونوں مصیبتوں سے بھیں یہاں اس واقعہ اور کش مکش کی طرف اشارہ ہو۔

جی، صدق مقال سب کو ترک کر بیٹھے ہیں اگر ڈارون کی یہ تھیوری درست ہو کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو اس منزل تمدن پر اہل یورپ کو انسانیت کے بہت سے اعلیٰ محاسن کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہیں اس پر افسوس کرتا ہوں سہ غ

یا الہی یہ کیسے بند رہیں ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے
میں نے عرض کیا آپ نتیجہ کو دیکھ کر افسوس کرتے ہیں یا ڈارون صاحب کی
تھیوری پر ایک کاری ضرب لگاتے ہیں شعر کیا ہے چشمِ احوال پر ع
کجائی نماید کجائی زند

فرمایا ہمارے لیڈر حکومت سے بنیاری اور قوم سے ہمدردی کا اعلان
کرتے ہیں لیکن اُن کے دل کو ٹٹوتا ہوں تو وہی یورپ زدہ پاتا ہوں کام
میں خلوص نیت اور پاس مذہب بہت کم ہوئے غ
غصے میں غریبوں کی یہ جبین جبین چلی جائے
صاحب کی مشینوں کی وہ ہیں ہیں بھی چلی جائے

لیکن جو قضا پیش نظر ہو تو خدا را
کچھ خدمت ارباب رو دیں بھی چلی جائے
ان لوگوں کو نہ خدا یاد ہو نہ اپنی قبر ان کے دل میں خدا کی عظمت کا تصور
یوں بٹھاتا ہوں سہ غ

خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں
حقیقت یہ ہے کہ اب زمانہ حساس اور غیر تمدن شخص کے جینے کا نہ رہا ہے
ای زمین تو اپنی تہ میں مجھ کو جائے گور کو وہ رہے زیر فلک اللہ جس کو زور کو

خوب تکلفیں اٹھائیں نزع میں لگے گئے غ
ہم مگر غرض میں کہ دنیا کے وہ سب جگہ گئے
۲۸ فروری ۱۹۲۱ء

میں نے عرض کیا کہ شاہ دگلیر صاحب کا خط آیا ہے، انہوں نے شکایت
لکھی ہے کہ آپ نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔ کچھ غیر مطبوعہ اشعار مانگتے
ہیں۔ اگر آپ لکھا دیں تو روانہ کر دوں۔ چند اشعار منتخب کر کے فرمایا یہ بھیج
دیجئے مگر صاحب یہ اخبار و رسائل والے لوگ میرے اشعار تکمیل ذوق اور
تسکین چشمی کے لیے نہیں مانگتے اس خیال سے مانگتے ہیں کہ جس پرچہ میں یہ اشعار
شائع ہوتے رہیں گے اس کی خواہش اور مانگ زیادہ ہوگی تھوڑی دیر فرمایا
ایک اور اچھا شعر ہو گیا ان اشعار کے بعد آخر میں اسے بھی لکھ دیجئے۔ میں
نے عرض کیا بہت اچھا فرمائیے۔ فرمایا ہے
یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں رسالہ خدمت ہے

ہمارے تختہ دل ہیں آپ کا مال تجارت ہے
فرمایا: انگریز ہندوستان کے اختلاف کا مقابلہ کر رہے تھے اب خود ان کے
گھر میں آگ لگ گئی ہے اور آئرلینڈ نے برطانیہ کو دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ کوئی طاقت
زمانے کی ہوا سے نہیں لڑ سکتی ہے غ
قوی تر کے مقابل سر کو خم کرنا ہی پڑتا ہے قضا آتی ہے تو صاحب کو بھی مرنایا پڑتا ہے
فرمایا: دوسرا شعر سنو

باز آتے ہیں وہ پھر بھی کب اپنی بازیوں سے
بیک قضا ہے بخود جدت طسرازیوں سے

۱۳ اپریل ۱۹۲۱ء

فرمایا: بعض اجاب نے ہاتھ جی کو مشورہ دیا تھا کہ شملہ جا کر وائسرائے
 لارڈ ریڈنگ صاحب سے مل لو، مگر وہاں سے واپس آئے ہیں تو ان اجاب
 کی نادانی یا غلط مشورہ پر متاسف ہیں کہ مولانا محمد علی کے دل میں فرق پڑ گیا
 اور ہندو مسلم اتحاد متاثر ہوا۔ غ
 واپسی گاندھی کی سن کر شملہ پر نور سے یاد آئی واپسی موسیٰ کی کوہ طور سے
 فرمایا: حکومت و دست لوگوں پر بھی طعن و تشنیع کرنا اچھا نہیں، وہ بھی سوسائٹی
 کے رکن ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس خیال کے تحت کر رہے ہیں کہ ان کا
 اور ان کی قوم کا اسی میں فائدہ ہے۔ ممکن ہے اپنے اس طریقہ کو دل سے پسند
 نہ کرتے ہوں۔

خوشا داک بہت سفاک کی کس کو خوش آتی ہے
 کوئی کیا شوق سے کرتا ہے مجبوری کراتی ہے
 ہم کو کیا حق ہے کہ کسی کو خود غرض اور منافق کہیں شاید اُن کو غرض اور مصلحت
 اس سے زیادہ پیاری ہو جتنے ہمیں عشرت ہیں۔ ہماری تو جیسی گزر گئی گزر گئی
 موجودہ تعلیم نے آئندہ نسلوں کی ذہنیت اور عقیدہ کا بالکل ناس لگا دیا ہے۔
 دیکھو میں نے فارسی کے اس شعر پر اپنے مصرعے لگا کر اُس سے اپنے مفید
 مطلب کیا کام لیا ہے
 کافر عشقم مسلمانی مراد رکاز نیست
 ہر رگ من تار گشتہ حاجتِ ناز نیست
 کہتا ہوں

جب کہا ختنہ کو تو طفل مسلمان نے کہا
 کافر عشقم مسلمانی مراد رکاز نیست
 جب جنیو کو کہا طفلِ برہمن بول اٹھا
 ہر رگ من تار گشتہ حاجتِ ناز نیست
 میں نے بہت داد دی اور عرض کیا کہ یہ معمولی لیاقت کی بات نہیں کہ کسی

دوسرے کے کلمے کو اپنی زبان سے اس طرح پیش کر دیا جائے کہ معنی میں زمین
آسمان کا فرق ہو جائے اور مطالب بھی اپنے مفید مقصد پیدا ہو جائیں آپ نے
مصرع لگا کر رگ اور مسلمانی میں نئی جان ڈال دی۔ نیولین نے جب ماسکو پر
فوج کشی کی تو روسی جنرل نے اس سے کہا۔ بونا پارٹ! ہماری تمھاری جنگ
میں خیال کا بہت بڑا فرق ہے یاد رکھو تم یہاں سے کامیاب نہیں جاسکتے تم دولت
کے لیے لڑ رہے ہو اور ہم آبرو کے لیے۔ نیولین نے مخالف کا کلمہ اسی پر
یوں پلٹ دیا ”ہاں بیچ ہو جو چیز جس کے پاس نہیں ہوتی اس کے لیے لڑنا
ہی (مراد یہ کہ ہم دولت سے محروم ہیں اور تم آبرو سے)۔“
۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء

فرمایا محمد علی شوکت علی کے قید کئے جانے سے دل کو دکھ ہوا اور یہ اشعار
نکل گئے:

بیادِ رنجِ یارانِ نظر بند کیا ہم نے بھی اب ملے کا در بند
زباں ہر ناتوانی سے اگر بند میرے دل پر نہیں معنی کے در بند
فرمایا پنجاب کے مارشل لا کے احساس نے یہ شعر کہلوا دیا ہے
زباں بند ہو اس عہدِ پزنگاہ کے بعد سکوت ہی مجھے رہتا ہے اب تو آہ کے بعد
فرمایا: یورپین سیاست نے ترکی اور ایران کو تباہ کیا اس پر چیتاں کی شکل میں
غم دیکھیے

سہ تراش اُن کا کاٹا اُن کا پاؤ وہ ہوئے ٹھنڈے گئے یہ بھی پگھل
شیخ کو تیخ کر دیا مومن کو موم دونوں کی حالت گئی آخر بدل
دوسری چیتاں دیکھو
دکھا رہی ہے یہ ترکیبِ حسنِ طبعِ سلیم علی کی تم میں جگہ ہو تو بس ہے یہ تعلیم

ہماری تعلیم کا آج کل ایسا ناس گھاہی کہ کام کی بات ہم کو ایک نہیں آتی ہم یہ نہیں جانتے کہ ملک کی خام پیداوار کیسی برباد جا رہی ہے اور اس کو کس طرح مفید بنائیں مگر جانتے ہیں تو ڈارون اور ہیلے کے فلسفہ میں وقت ضائع کرنا اور سوچتے بیٹھنا کہ ہمارے جدِ اعلیٰ حضرت میمون تھے یا حضرت آدمؑ

ہمارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندرچے کیوں کر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدمؑ بنے کیوں کر
فرمایا: بعض مذہبی پیشوا اعلانات کی حد تک بڑے پر خلوص اور پر جوش معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ذرا عمیق نگاہ سے کام لیجیے تو صاف خود غرض اور جاہ طلب نظر آتے ہیں۔ غ

بظاہر تھا براقِ راہِ عرفان جو دم برداشتم لیڈرِ برآمد
۲۴ اپریل ۱۹۲۱ء

فرمایا ایک مغرب پرست اور حکومت و دست خان بہادر صاحب کے انتقال پر دہلی کے بعض مسلمان بگڑ گئے کہ اس بعیت کو ہم مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیں گے اس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی اور یہ شعر نکل گیا۔

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہی گفتنی

فرمایا مادرِ ہند کو اس پر افسوس آتا ہی میرے فرزند اگر مفلس نہ ہوتے تو چند سکوں کے عوض میں باہر ملکوں میں جا کر کیوں کٹ جایا کرتے اس مفہوم کو ادا کرنے کے واسطے میرے ذہن میں مرغی کی مثال آئی۔ مرغی اس امید

میں انڈے دیتی ہر کہ اُن سے بچے نکلیں گے لیکن اُس کی بڑبڑی دیکھو کہ اُس کے
انڈے بارکوں میں فروخت ہو کر فوجیوں کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ غرض کہ اس
مفہوم کو یوں ادا کر دیا ہر ہے

مرغی نے کہا کل کیسی کیمپ میں گئے انڈا وہی اچھا ہر کہ بچے جسے کھلے
ترکی کی تباہی کا خیال آیا تو اس زمین میں یہ شعر نکل گیا ہے
دیوار شکستہ نے بلندی کی دعا کی گردوں کی عنایت سے سڑک بن گئی ہے
فرمایا میرے ذہن میں پہلے یہ مصرع آیا تھا۔ غ

جو چٹا منی ہر وہ گستا منی ہر

آخر اس کو چار مصرعوں میں یوں بھلا دیا ہر ہے غ
کہاں اُردو دہندی میں زر نقد وہی اچھا ہر جو گستا منی ہر
میرے نزدیک تو بے سود یہ بحث میان ہمد و جستا منی ہر
۸ مئی ۱۹۲۱ء

سید صاحب نے مجھے اور سید نور الحسن صاحب سب رجسٹرار کو دعو
دی تھی کہ ۸ مئی کی شام کو ہم دونوں کھانا ان کے ساتھ کھائیں ہم دونوں
کے جانے میں کچھ دیر ہو گئی سید صاحب نے حالت انتظار سے بیزار ہو کر
ایک پوسٹ کارڈ نور الحسن صاحب کے نام لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا:-

”خدا کے بندو۔ بنی نیدھا (ملازمہ) نے بہت اہتمام سے دو چار
ہانڈیاں تیار کیں۔ ۹ بج گئے لیے بیٹھی ہیں جھنجھلا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پلاؤ
مزعفر تو ہر نہیں گوشت ترکاری بورانی کی بات ہی کیا! لیکن دل میں کہہ رہا
ہوں کہ ایسی وعدہ خلافی اور بے پروائی چہ معنی دار و قمر الدین صاحب کو
تسلیم“ ہم دونوں رات کو ۹ بجے کے بعد پہنچے تو سید صاحب نے شکوہ

کیا اور کارڈ لکھ دینے کا تذکرہ فرمایا جو ہیں دوسرے دن ملا۔ مینر پر کھانا چنا گیا سید صاحب کے بہنوئی راجہ میاں صاحب بھی شریک تھے کھانے میں چپاتی، تورمہ، فیرنی اور بورانی تھی۔ سید صاحب نے اپنے لیے چھوٹی چھوٹی خستہ روغنی ٹکیاں تیار کرائی تھیں، اُن ہی کو زیادہ تر بورانی سے کھاتے رہے مشکل سے ڈھائی تین چھانک غذا کھائی ہوگی میں نے دریافت کیا کہ کیا سب کھانا نیدھانے پکا یا ہو؟ فرمایا: ہاں۔ اب کھانے کا لطف کیا ہو کھانوں کی لذت اور دسترخوان کی نفاست تو عشرت حسین کی والدہ اپنے ساتھ لے گئیں اُن کی زندگی میں اس عشرت منزل میں چار چار باورچی کھانا پکاتے تھے۔ شاید ہی کوئی دقت ایسا گزرتا ہو جو کوئی نہ کوئی جہان نہ رہتا ہو ہائے اب تو یہ

جل بے اسباب غفلت چشم عبرت و حکمی میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی
۱۹۲۱ء

فرمایا: بعض مسلمان ہنود سے اس لیے میل کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کی بد اور قوت سے مٹی ہوئی خلافت بحال کرنے میں سہولت ہوگی۔ اُن سے کہتا ہوں نیک ہو منزل تو اکبر راہ بد کیوں مانگی دوست کے ملنے کی دشمن سے بد کیوں مانگی فرمایا حکومت کا ناز اور غرہ سب حق بجانب ہی اُس کی اتنی خطا نہیں ہو جتنی ہماری ہو ہم حریص اور جاہ طلب ہیں اس لیے حکومت مغرور ہو رہے ہیں ہتوں کی خود نمانی میری غفلتوں پیدا میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں منگا کر کرتے مسٹر سہنا بے وجہ گورنر اور سر نہیں بنا سگئے جو کوئی حکومت دوستی کا ایسا ثبوت دے گا اسے ضرور صلہ ملے گا اس مضمون کو یوں دبا کر کہا ہے خدا کے گھر سے اب آنر کی جو خبر آئے ہتوں کے پاؤں پر ہم کو تو سر نظر آئے

میں نے عرض کیا کہ آپ سے یہاں بھی وہی کمال فن دکھایا ہو جو اس شعر میں
 ظاہر کیا تھا ہے
 یوں تو ہیں جتنے شکونے سب کو فکر باغ ہو یہ مگر سچ ہو کہ لالہ ہی کے دل میں داغ ہو
 وہاں لالہ سے تو یہاں آنر اور سر سے آنریل سرسنبھا کی طرف خیال منتقل
 کیا ہو فرمایا اب اس خیال کا عکس دیکھو ہے
 جس کے دل میں شان باری کا تصور گھر کرے ان کو کیا پردہ کہ کوئی بُت میرا آنر کرے
 ۹ جولائی ۱۹۲۱ء

میں ڈیڑھ ماہ کے واسطے بدایوں چلا گیا تھا۔ اس لیے تید صاحب
 کے پاس حاضر نہ ہو سکا خطوط آتے جاتے رہے اس زمانے میں مجھے بھی باجوہ
 اس کے کہ وطن میں تھا اس کا خاص احساس ہوتا رہا کہ کسی بڑے آبشارِ مسرت
 سے دُور ہو گیا ہوں۔ تید صاحب کو بھی یہ زمانہ بہت کھل گیا (جیسا کہ ۱۳ مارچ
 جون ۱۹۲۱ء والے خط کی عبارت سے ظاہر ہو رہی جو مجھے پرتاب گڑھ سے
 بدایوں بھیجا تھا) اب آیا تو جی کھول کر اشعار سنائے اور باتیں کیں۔ فرمایا جو
 لوگ اُردو فارسی رسم الخط پر اعتراض کرتے ہیں اور ہندی کے مطبوعہ اور
 ٹائپ شدہ خط کو ترجیح دیتے ہیں وہ ہندی کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کے نقص
 کو نہیں دیکھتے کہ ایسی تحریر کی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ لکھا کیا ہو میں نے ان
 لوگوں کا مذاق اڑایا ہو ہے

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو مر کے سمجھا ہوں میں اتنا کہ یہ بھی کام کی بات
 بس کہ تھانامہ اعمال مرا ہندی میں کوئی پڑھ ہی نہ سکا ہو گئی فی الفور نجات
 فرمایا میرے ایک دوست مولوی محمد عسکری صاحب ایک ریاست میں کو تو ال
 ہیں۔ وہ اُردو کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔ دیکھئے میں نے اُردو اور

ہندی کا موازنہ ایک شعر میں کیا گیا ہے غ
 اُنھیں اردو کی طرف داری میں بھائی عسکری ہم تو کہتے ہیں بتوں سے جس کہا توں کری
 میں نے عرض کیا کہ ”ہم تو کہتے ہیں“ کے مقابلہ میں ”جس کہا توں کری“ جیسا
 تو کہے گا دیا کروں گا، رکھ کر دونوں زبانوں کی گفتگو کے آداب کیا خوب
 آئینہ کیے ہیں۔ لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ قابل داد آپ کے قافیہ
 کی تلاش ہے۔ فرمایا: مسلمانوں اور ہندوؤں کے تمدن کا فرق دیکھو صغ
 وہ بغداد میں ہیں میں مندر میں گم ہوں شتر غمزہ وہ ہیں تو میں گاؤ دم ہوں
 میں نے عرض کیا کہ آپ کے شتر غمزہ اور گاؤ دم کے شوق نے مطلب کو
 گول کر دیا۔ میں نہیں سمجھا کہ کہنا کیا چاہتے ہیں فرمایا مجھے خیال یہ پیدا ہوا کہ حکومت
 برطانیہ نے ہندوستان میں آرام و آسائش کے سامان بہم پہنچا کر ہم کو احمدی
 بنا دیا اب وہی محل و نقل کی آسانیاں عرب میں پیدا کر رہے ہیں گاڑی دیکھ کر
 اب عربوں کے بھی پیر پھرتے جا رہے ہیں میں نے کہا یہ خیالات آپ کا یہ شعر
 تو ظاہر کرتا نہیں۔ فرمایا میں نے ان خیالات کو ایک اور جگہ دوسری طرح سے
 صاف کیا ہے ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہم اپنی مہل باتوں
 کو نہ چھوڑیں اور تم اپنے اُسی قدیم دائرہ تمدن میں کو لھو کے بل بنے رہو دلو
 کی اس فضولی سے حکومت خوش ہے غ

ہم گیا کے دھنوں سینگ تم سرحد پر بیجو ہینگ
 صاحب لوگ یہاں کی نعمت چکیں فار دی ٹائم ہینگ

میں نے عرض کیا سینگ کا قافیہ بی انگ (Being) کیسے درست
 ہو سکتا ہے فرمایا: پھر آپ عرضی ہے پر اتر آئے اچھا ان خیالات کو چھوڑو،
 ایک عارفانہ شعر سنو

حشر تک کھل نہ سکے راز اسے کہتے ہیں جب تو پھر بھی کرونا ز اسے کہتے ہیں
میں نے تعریف کی۔ فرمایا: دوسرے شعرا جو غیروں کے خیالات نظم کرتے ہیں اور
خود جذبات سے کورے ہوتے ہیں ان کی ایسی حالت ہی کہ
صورت لیلا نہ دیکھی پڑھ لیا دیوانِ قیس شاعری آئی نہیں لیکن نہاں ۱۲ ہو گئے
۱۲ جولائی ۱۹۷۷ء

میں مولوی مقبول احمد صاحب سر رشته دار کشمزی الہ آباد کے ساتھ
عشرت منزل پہنچا سید صاحب نے فرمایا میں نے ایک بزرگ شاہ عبدالغفور
صاحب کا نام کسی اخبار یا رسالہ میں پڑھا تھا اس کے بعد میں نے خواب میں
دیکھا کہ شاہ عبدالغفور صاحب میرے پاس آئے ہیں اور انھوں نے میرا جسم
اپنے ہاتھ سے دھلایا ہے۔ بیدار ہو کر میں نے شاہ دگیر صاحب کو خط لکھا کہ عبدالغفور
شاہ صاحب کون بزرگ ہیں۔ آپ کو علم ہو تو ان کا پتہ لکھیے۔ پتہ آ گیا تو میں
نے شاہ عبدالغفور صاحب کو ایک خط لکھا اور بلا یا خط یا کروہ خود تو نہیں
آئے کچھ اپنی تصنیفات بھیجیں اور حالات لکھیے یہ معلوم ہو کر کہ شاہ صاحب غلات
کے پر جوش کارکن ہیں میں ڈرا کہ اگر یہ آگئے تو کہیں گورنمنٹ کی طرف سے
میں شک و شبہ کا مرکز نہ بن جاؤں لہذا میں نے ان کو اپنی علالت کا ذکر
کرتے ہوئے روک دیا اور لکھا کہ پھر کبھی دوسرے وقت تکلیف دوں گا فرمایا
اس مرتبہ پر تاب گرھ جا کر مجھے بہت وحشت ہوئی بارش کی وجہ سے بنگلہ
جزیرہ بن گیا تھا ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا میں نے عرض کیا آپ نے انگریزی
شاعریشلی کے اس شعر کے پہلے مصرع کا پورا ترجمہ کر دیا۔

Water water everywhere

And not a drop to drink

فرمایا کہ کیا بتاؤں کہ وہاں کس تکلیف خیال کے ساتھ وقت کاٹا۔ میں نے عرض کیا: مشکل سے وقت کاٹنے پر خیال آیا ریاض خیر آبادی اپنے مخصوص مضمون شراب پر فرماتے ہیں سہ

روزے رکھ کر بلا کے دن کاٹے ہیں محو سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں
میں نے ہم تم تنہ لبوں نے ساتی سینے سے سبولا لگا کے دن کاٹے ہیں
۲۸ اگست ۱۹۲۷ء

فرمایا: موجودہ طریقہ تعلیم میں ترمیم کی بہت ضرورت ہے اس نے ہم کو نکما، بزدل اور پست ذہنیت کا بنا دیا اس تعلیم کو حاصل کرتے سم کو ایک صدی ہو گئی اور اب تک اپنے ہاتھ سے ایک سوئی بنا نہیں آیا۔
آئی تو خوشامد اور ضمیر فردشی سہ
دلی خواہش تو ہے بیشک کہ ایک اور ایک دوہیکے

مگر کہنے کو ہوں موجود سب کچھ آپ جو کہیے
میرے طریق عمل سے اب تو نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں

مگر سمجھتا ہوں اس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
تعلیم جو دیجاتی ہے ہیں وہ کیا ہے نری بازاری ہے

جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے
مسلمانوں کی اخلاقی حالت اہل ہنود سے پست ہے سہ

جو پوچھا مجھ سے دور چرنے کیا تو مسلمان ہے
میں گھبرا یا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کردن اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے

اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قبر یزداں ہے

بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہر بندہ
لیکن مولوی ہرگز نہیں ہر خانہ سال ہر

حکومت بھی ہماری اس منافقت سے اور جذبہ خود پسندی سے بیزار ہے
کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوچے رکاز ہمارے کام تنگ ہو وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور
فرمایا یہ شعر میں نے فارسی کے اس شعر سے متاثر ہو کر کہا تھا
ہر کجا افتادہ بینی خشت درویرانہ ہست فردا د فتر احوال صاحب خانہ
فرمایا بعض لوگ گاندھی جی کے Passive resistance (مقاومت
بجھول) پر ہنستے ہیں مگر غور کیجئے تو یہ اہل دل کی بددعا کا سا بہت موثر حربہ ہے
خواجہ حسن نظامی صاحب کے دا دا غدر میں پکڑے گئے صاحب نے پوچھا تھا
ہتھیار کہاں ہیں جیب میں سے تسبیح نکال کر پیش کر دی کہ یہ ہیں۔ دل کے بجائے
دماغ پر ایمان رکھنے والے شورش پسند مخالفین کو میں ان اشعار میں جواب
دیتا ہوں

میں کب کہتا ہوں اے دعا عطا کہ میں نے کار دیں سمجھا
مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا
بے کار ہر سکوں تو تلاطم بھی کچھ نہیں
ہم کچھ نہیں یہ سچ ہے مگر تم بھی کچھ نہیں
میں نے عرض کیا خوب آپ بظاہر اپنی اہمیت سے انکار کر رہے ہیں لیکن
حقیقت میں اہمیت ثابت کر رہے ہیں کہ ہم سب کچھ ہیں۔ ایک دوسری
جگہ بھی آپ نے انکار کے پردے میں ایک لطیف خود ستائی چھپائی ہے
تعلیٰ کی نہیں لیتے ہم ایسے ہیں ہم ایسے ہیں
مگر ہم جتنے ہیں بیزار دنیا سے کم ایسے ہیں

فرمایا: اشارۃً آپ نے خوب یاد رکھا۔ اچھا خود ستائی کا ایک شعر اور سنیے سے
کب میں کہتا ہوں جنوں میں میں میں کل اکبر مگر انصاف سے کہیے کوئی آنا بھی تو ہو
بھار کے پہلو میں اقرار ایک دوسری جگہ دیکھیے

نکل بیج میری وہ کرتے تھے اور بزم میں میں میں شرمندہ تھا
میں کچھ بھی نہ تھا اور تھا بھی اگر اُس وقت میں تھا جب نہ تھا
میں نے تعریف کی کہ کیا پیارے ٹکڑے ہیں اور کیا برجی ہر فرمایا برجی اس مطلع
میں دیکھیے

جس طرف اٹھ گئی ہیں آہیں ہیں چشم بدو ر کیا نکلا ہیں میں
فرمایا: بالشوئیک لوگوں نے زار کی صدیوں کی جی ہوئی سلطنت مٹی میں ملائی
اس کو میں حکومت زار کے مظالم پر ایک عتاب خداوندی سمجھتا ہوں دیکھیے
میں نے اسی پر کہا ہے

آسمانی توپ چلتی ہے کبھی صدیوں کے بعد لیکن اُرجاتی ہیں ساری غفلتیں اک غیر میں
رات زیادہ ہو گئی تھی میں نے اجازت چاہی فرمایا آپ آجاتے ہیں تو دل
بہل جاتا ہے اگر مہر کے توکل بھی آئے بلکہ کھانا بھی ساتھ ہی کھائے میں نے
عرض کیا: ممکن ہو تو حاضر خدمت ہوں گا مگر کھانے کے لیے میرا انتظار
نہ فرمائیے۔

۲۴ اگست ۱۹۲۱ء

فرمایا: آپ اچھے آگئے میں آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ میں نے کہا ارشاد
فرمایا: دیکھیے یہ گاندھی نامہ میں مرتب کرنا چاہتا ہوں آپ اس خاکہ کے بموجب
اس سفید کاغذ پر سطور کھینچ دیجیے میرا ہاتھ کا ہوتا ہے میں نے حسب ارشاد خاکہ تیار
کر دیا۔ یہ پہر کا وقت تھا مگر مجھے اس کثرت سے تھے کہ بیٹھا دشوار ہو گیا۔ فرمایا

آپ کو پھر بے چین کر رہے ہیں مجھ کو تو نظر بھی نہیں آتے موزہ اُتار کر دکھایا کہ دیکھے میرے پیر کو کاٹ کاٹ کر کیا حال کیا ہے مگر مجھ کو تو اب تکلیف کا اہل بھی جاتا رہا کیڑے کوڑوں نے بھی دکھ لیا ہے کہ اس سے زیادہ مجبور اور کون ملے گا سہ غ

مرگ کا خطرہ مبارک ہوا نہیں جو زندہ ہیں ہم تو مروہ ہیں قیامت کی ہیں امید ہے میں نے تعریف کی فرمایا: اس شعر میں زرا ذومعنی لطف دیکھیے سہ غ لذت شہرت لیے جاتی ہے سب کو سوئے جیل

ہوم ردلی خوان پر یہ لطف جلی دیکھیے

۲۸ اگست ۱۹۲۱ء

مغرب کے قریب حاضر ہوا پوچھا اس وقت آپ کیسے آگئے یہ وقت تو آپ کا افغان شہزادوں کی ٹیوشن کا تھا میں نے عرض کیا ہاں چوک میں کچھ خرید فروخت کرنا تھا۔ فرمایا فروخت کو تو نہیں اگر کچھ ہے تو خریدنے کو میں تیار ہوں میں نے عرض کیا خود فروخت ہونے کو حاضر ہوں سہ

کوئی تشریف لا کر مول لے لے میری قسمت ہے ایک آنا کس کا

(عالی بدایونی)

ذومعنی ”آنے“ کی داد دی میں نے عرض کیا عبدالرحیم خان خاناں کی زبان سے میرا دوسرا جواب ملاحظہ فرمائیے سہ

مرا فروخت محبت دے نمی دایم کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است شعر سن کر خوش ہوئے۔ فرمایا اچھا ہوا آپ آگئے اب اطمینان سے بیٹھیے۔ آپ نے کھانا کھایا ہیں نے عرض کیا ہاں کھا کر آیا ہوں۔ فرمایا تو اچھا مٹھائی کھائیے یہ کہہ کر اندر سے بانج گلاب جانیس منگوائیں۔ میں نے کہا آپ بھی کھائیں

فرمایا میں نہیں کھا سکتا، مجھے سخت پیٹن ہے۔ میں نے پوچھا کب سے فرمایا آج چاروں
 سے کچھ معمولی سی خلش تھی پرسوں میں ہمشیرہ کے یہاں گیا وہاں پیٹ میں ایسی مرد
 ہوئی کہ تکلیف کو ضبط نہ کر سکا۔ حکیم محمد فخر صاحب کو وہیں بلایا انھوں نے نسخہ لکھا
 ہمشیرہ نے وہیں تیار کر کے پلایا جب زرا درد کم ہوا تو میں نے والی کا ارادہ
 کیا مگر پیدل نہ آ سکا اتنے سے فاصلے کے لیے آٹھ آنے شکر م کے کرایہ کے دو
 شب کو کھانے میں بھی بے احتیاطی ہوئی، بنی نیدھانے بینگوں کا بھرتہ بنا رکھا
 تھا اس سے پیٹ کے درد میں پھر زیادتی ہو گئی۔ رات بھر تکلیف سے کٹی
 میں نے عرض کیا آپ نے غضب کیلے پیش میں بینگوں کا بھرتہ کھایا فرمایا ہاں
 مولوی فخر صاحب کو آج صبح پھر بلایا تھا وہ بھی تعجب کرتے تھے مگر مجھے خیال
 نہ تھا کہ اتنا نقصان کرجائے گا۔ میں نے کہا بینگوں کے مضر اثر سے آپ اصولاً تو
 واقف تھے خود فرماتے ہیں یہ

سینہٴ مس کا اُبھارا دل فدا انگیز ہو لوگ سچ کہتے ہیں بادِ بنجان باد انگیز ہو
 شعر سن کر ٹپنے لگے فرمایا رات کی تکلیف خدا کی پناہ معلوم ہوتا تھا کہ قبضِ رُوح
 ہو رہا ہو بار بار پانچا نہ کو جاتا تھا مگر رتی رتی بھر آنو کے سوا کچھ خارج نہ ہوتا
 تھا مسکرا کر فرمایا اس تکلیف اور مصیبت میں رات قدموں پر پانچا نہ تو نہ نکلا
 ایک شعر نکل گیا یہ غ

مفتِ خفت ہوئی لوگوں سے کہ دوڑو میں چلا

نزع سمجھا تھا جسے قبض کی حالت نکلی
 فرمایا اجی اب تو میں شاعری سے مصیبت میں پڑ گیا ہوں جو خیال بھی آتا ہو
 نظم کی صورت اختیار کر لیتا ہوں کہاں تک لکھے اور چھاپے جاؤں بہتر ہے کہ
 خود ہی چھپ جاؤں حافظ عبدالمجود صاحب آگئے اُن سے اپنے وہ اشعار

لحٰن کے ساتھ سُسنے یارے باشد، مزارے باشد۔ اخباری خبروں کے تذکرہ پر فرمایا کہ گاندھی جی ابھی حکومت سے سچی لڑائی نہیں لڑ رہے ہیں ابھی تو طالب و مطلوب کی سی آپس کی ہاتھ پائی ہو کر لائیں مارنے اور کھانے میں ہر دو کو مزا آتا ہے اس لیے میں لوگوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس لڑائی میں حائل نہ ہوں یہ طبع گاندھی و گورنمنٹ کو برہم نہ کر دو غ ہاتھ پائی ہو شب و صبح کی کچھ غم نہ کرو فرمایا اور سُسنو غ

نہ یہ دینی لڑائی ہے نہ سرکاری لڑائی ہے مری اُن کی ابھی تو صرف بازاری لڑائی ہے میں نے عرض کیا ”بازاری“ خوب فرمایا اعمال حکومت سے زیادہ لٹکا شائر کا بازار متاثر ہو رہا ہے فرمایا ماشاء اللہ آپ نے خوب دیکھا معانی کے اس پہلو پر میں نے نظر نہیں کی تھی فرمایا زرا اس شعر کو دیکھیے غ
گاندھی میں سب بھلائی لیکن مجھ سے ہیں صاحب میں سب خرابی لیکن خوب چوکس میں نے عرض کیا کہ الفاظ کے کاروبار میں آپ کس غضب کی لیاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ادب کے گرے پڑے سنگریزوں کو ہاتھ میں لیتے ہی ہیرا بنا دیتے ہیں آپ نے اس شعر میں غ

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں جس طرح ایک حقیر لفظ ”فالتو“ کو مغز بنادیا تھا اسی طرح اب اس شعر کے لفظ ”چوکس“ میں وہ چار چاند لگائے ہیں کہ حن بیان منہ جوئے لیتا ہے اس میں کیا کیا معنی بھرے ہیں - ع

جو چاہے آپ کا حن کرشمہ ساز کرے
نہ کہنے پر تو آپ اتنا کہ جاتے ہیں کہ غ
قناد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

میری اس داد سے مسرور ہوئے فرمایا آپ نے ماشا اللہ بہت عمیق نظر پائی ہو
 اور خوب بات کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں سے غ
 بظاہر دیکھنے میں گو شریک کیپ ہو اکبر مگر جس کو بصیرت ہو اُسے پہچان جاتا ہو
 فرمایا اس شعر کا عرفانی رنگ دیکھیے سے غ
 اس کو نہ پاسکا مگر اس غم میں دسکا یہ بھی ہو اُس کا شکر کہ اتنا تو ہو سکا
 میں نے عرض کیا: بہت صحیح فرماتے ہیں سے غ

جو خدا کی یاد آئے تو اُسی کی مہربانی
 فرمایا اب کمزوری اتنی ہو گئی ہو کہ بیٹھ جاتا ہوں تو اُٹھنے میں تکلیف ہوتی ہو
 میں نے عرض کیا جلیل صاحب نے اس کمزوری کو اپنی ذہانت سے رحمت
 قرار دیا ہو سے

اُٹھنے نہ دیا کسی کے در سے احسان ہو مجھ پر لاغری کا

فرمایا لاغری اور ناتوانی پر آپ کو میرا وہ شعر یاد نہیں سے
 ناتوانی میری دیکھی تو مصور نے کہا ڈر ہو تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصور کے ساتھ
 میں نے عرض کیا جی ہاں بالکل یا خیال ہو ایک ایرانی بھی گھلتے گھلتے مازیت
 ہی کھو بیٹھا حضرت عزرائیل کو تلاش کرنے میں فسل ہوئی سے
 ملک الموت بیا مد و مراجعت مینافت نالہ ہر خپ خبر داد کہ دریر ہن است

باب چہارم

مرض الموت اور انتقال

میں سید صاحب کی اس سچپن کو مرض الموت بالکل نہ سمجھتا تھا۔ خیال تھا کہ چند روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ عقلا نے غلط نہیں کہا ہر کہ مرض اور دامن کو کسی حالت میں حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ مگر سید صاحب نے اس عمر میں مرض کو حقیر سمجھا کبھی زیادہ تکلیف محسوس کی تو حکیم فخر صاحب کو بلا کر دکھا دیا جو اپنی دردِ طینتی سے خلقِ خدا کا علاج بغیر فیس کے کیا کرتے تھے۔ یونانی یا انگریزی دوا بھی باندی سے نہیں پی تا ایں کہ مرض نے گور کنارے لگا دیا۔ ۲۰ ستمبر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حالت خطرناک ہے۔ پہلے باہر ملازم نے کہا کہ اندر ہیں، ہمیشہ صاحبہ بھی موجود ہیں، کمزوری کے باعث اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے اطلاع کرائی پردہ کرادیا اور مجھے اندر بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے میں نے کہا آپ کیا غضب کر رہے ہیں تکلیف میں خود کو تکلیف میں ڈال رہے ہیں لیٹے رہیے اصرار کے باوجود نہیں مانے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا میں لیٹے لیٹے بھی تھک گیا ہوں برسوں آپ داپس چلے گئے تو مجھے اطلاع ہوئی۔ بہت افسوس رہا۔ بیماری کی حالت میں آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں یہاں تنہائی میں بی نیدھاسر پر گوز کرنے کو موجود ہیں آپ تنہا تو ہیں یہیں کیوں نہیں آجاتے میں نے عرض کیا تنہا نہیں ہوں چھوٹا بھائی شمس الدین بھی ساتھ ہے۔ فرمایا

سیہ خانہ وہی ہوا اور وہی سوز غم فرقت میرے کس کام آیا آپ کا رشک قمر مونا
 خیر جلد جلد دکھائی کیجیے۔ نیدھا کے لئے کے تار کو آواز دی اس سے کہا آپ کو وہ
 ناشپاتی دو جو بڑی تعریفی لائے ہو۔ وہ ناشپاتی کاٹ کر شتری میں لایا خود بھی دو
 قاشیں کھائیں فرمایا یہ بھی بڑا وضع کا پابند لڑکا ہی کل ایک سیب منگوا یا وہ
 بھی چھو پیے میں لایا آج ایک ناشپاتی بھی چھو پیے میں لایا میں نے اُس سے
 کہا ارے بھائی کیا اندھیر کرتا ہی کیا راج چوٹ کرے گا یہ کہہ کر بے اختیار ہنس
 پڑے۔ فرمایا اب ہنسنا بھی تو نہیں جاتا ہے

آرام کی تلاش نے رکھا ہی بے قرار ہر خواہش سکون سبب اضطراب ہی
 میں نے عرض کیا آپ کی حالت بہت ردی ہوئی جا رہی ہے دوا کس کی پی رہے
 ہیں فرمایا میں دوا کا زیادہ قائل نہیں ہوں بیماری اپنا کورس پورا کر لیتی ہے تو خود
 چلی جاتی ہے

طبیعوں کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا خدا کا کام ہے فضل و کرم کرنا شفا دینا
 فرمایا آپ کے ”اندھیر نگری چوٹ راجہ“ کے تسلسل خیال سے مو پلا یاد آئے
 خوب لڑ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو عرب خون ہر دیکھیے میں نے اُن پر آج ایک شعر
 کہا ہے یہ غ

ڈنڈے سے دبتا ہے کب یہ مو پلا اُس سے لڑنے کو رفل لا تو پ لا
 میں نے عرض کیا اول تو ڈنڈے کی ”ی“ گرتی ہے دوسرے واقعہ کے بھی تلا
 ہے حکومت مو پلاؤں کو ڈنڈے سے نہیں مار رہی ہے سر دست تو ناشپاتی خوف
 سے کام لے رہی ہے فرمایا تو ڈنڈے کو ”ڈانٹ“ کر دیکھیے میں نے عرض
 کیا میں دیکھ رہا ہوں میرے یہاں بیٹھنے سے مستورات کو پردے سے تکلیف
 ہو رہی ہے۔ اب اجازت دیجیے فرمایا اچھا جائے، میسبری بیماری کی خبر

مولوی محمد حسین صاحب کو کرتے جانے میں مولوی محمد حسین صاحب سے ملا ان کی کیفیت بیان کی انھوں نے دیکھنے کا وعدہ کیا۔ ۱۴ ستمبر کو عشرت منزل پہنچا تو مولوی محمد حسین صاحب موجود تھے سید صاحب گارٹے کی ایک چادر آدمی اوڑھے آدمی ہاتھ ہوئے لیٹے تھے جسم کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اتنا سوکھا ہڈیوں کا بیجر جنباں کیسے ہو فرمایا طاقت بہت زائل ہو گئی اب بیٹھا بھی نہیں جاتا ایک صاحب حصہ سوم کی کچھ جلدیں خریدنے آئے تھے یہ حصہ مولوی وحید احمد صاحب کے زیر اہتمام نقیب پریس بدایوں سے چھپ کر اسی ہفتہ میں آیا تھا ایک دن کے واسطے مولوی سید عشرت حسین صاحب آئے ہوئے تھے سید صاحب نے ان کو بالا خانے پر سے بلوایا اور کہا کہ ان خریدار صاحب کو مطلوبہ جلدیں دے دو اور منشی صاحب سے حساب لکھو ادو۔ اخباری خوروں کے سلسلے میں مولواؤں کا ذکر آیا۔ فرمایا یہ لوگ تعداد میں کم، جاہل اور غیر منظم ہیں۔ برطانیہ حبشی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حکومت نے اپنی مصلحت کے تحت جگرٹے کو خود طول دیا ہے کہ دنیا یہ سمجھے کہ اتنے شدید بلوے کو بھی حکومت نے دبا لیا اس پر ایک لطیفہ سنایا فرمایا ایک شخص ایک صحبت میں اپنی مردانگی کی ڈینگ مار رہا تھا کہ مجھ کو جھل میں سات شیروں نے گھیر لیا تھا ان سے جان بچا کر نکل آنا میری کام تھا ایک شخص نے کہا بات یقین میں نہیں آتی کہ سات شیر ایک جگہ ہوں اور زندہ چھوڑ دیں۔ بولا تو سات پیتے ہوں گے۔ معترض نے کہا پیتے تو شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں وہ تو آدمی کو درخت سے بھی کھینچ لاتے ہیں، کہنے لگا تو سات بڑے جنگلی کتے ہوں گے معترض نے کہا جنگلی کتے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان جنگلی کتوں کو آپ نے کچھ کم خرچہ خرچ کیا ہے جی یہ جس جگہ آجاتے ہیں وہاں سے شیر کو جان بچا کر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے کہنے لگا ممکن ہے میں اند میرے میں اچھی طرح نہ دیکھ

سکا ہوں اور سات لومڑیاں ہوں معترض نے کہا لومڑیاں کبھی گروہ میں نہیں رہتی
سات لومڑیوں کے یک جا ہونے کا امکان ہی نہیں ہے غرض کہ حج اور تردید نے
کچھ نہ چلنے دی تو آخر میں کہنے لگا اسی اصل بات یہ ہے کہ جنگل میں کچھ کھڑ بڑ ہوئی
میں اندھیرے میں اچھی طرح دیکھ نہ سکا کہ تھا کیا تنہائی اور تاریکی کی حالت میں
جنگل میں سے جان بچا کر آجانا بھی آپ کے نزدیک کچھ کم جرات کا کام ہے یہ
لطیفہ بیان کر کے تھوڑی دیر اور باتیں کرتے رہے میں اجازت چاہ کر چلا آیا
۵ و ۶ ستمبر کو میں عشرت منزل نہ جا سکا حالت دریافت کرائی تو معلوم ہوا کہ
دن بدن بچھتے جاتے ہیں عشرت حسین صاحب ۴ ستمبر کی شام کو اپنی ملازمت
پر واپس چلے گئے تھے میں ۷ ستمبر کو مغرب بعد پہنچا دیکھا تو نیم عافل تھے
بخار نہ تھا نبض ٹھیک تھی مگر کمزور چل رہی تھی اضطراب کی حالت میں کبھی ہاتھ
پیر کو حرکت دے رہے تھے راجہ میاں صاحب تنہا سر ہانے بیٹھے پھر اڑا
رہے تھے۔ راجہ میاں صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی آنکھیں کھولتے ہیں تو عشرت
کو دریافت کر لیتے ہیں کہ ابھی آئے یا نہیں میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی
دیر میں آنکھیں کھولیں میں نے سلام کیا، پہچان کر ہاتھ سے سلام کا جواب دیا
میں نے عرض کیا کہ اس وقت کی گاڑی سے جا کر میں عشرت حسین صاحب کو
بلا لاؤں؟ تھوڑی دیر تک مجھے سمجھتے رہے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں
بند کر لیں راجہ میاں صاحب نے کہا کہ صبح تار دیا تھا کوئی جواب نہیں آیا تو
حمید کو بھیجا ہر اب آپ کا جانا بے کار ہے میں تقریباً گھنٹے بھر تک خاموش اور
متاسف بیٹھا رہا اتنی دیر کے بعد پھر آنکھیں کھولیں۔ مجھے تھوڑی دیر تک نور سے
دیکھتے رہے اس کے بعد بولے۔ آپ کو بہت دیر ہو گئی اب آپ جا لیے۔
دونوں ہاتھ اٹھا کر مجھے رخصتی سلام کیا۔ نیدھا پاس کھڑی تھی اس سے بولے جا

دروازہ بند کر لو اب مجھے کسی کو نہ دکھاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کے پلنگ کے قریب پانخانہ کی چوکی پر اس میں سے بدبو آرہی ہے میں آپ کے پلنگ کو پکڑ کر زرا اس سے دُور کر دیتا ہوں کچھ جواب نہ دیا اور پھر غافل ہو گئے میں نے اور راجہ میاں نے پلنگ پکڑوا کر اس متغفن حصہ سے دور کر دیا اس کے بعد میں چلا آیا صبح کو حالت دریافت کرائی تو معلوم ہوا کہ وہی نیم بیہوشی کی کیفیت ہے کوئی افاقہ نہیں ہو سید عشرت حسین صاحب آگئے ہیں۔ ۹ ستمبر کو شام کے وقت شہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ عشرت منزل سے راجہ میاں صاحب کا رقعے کر ایک آدمی آیا اس میں تحریر تھا کہ آج تین بجے شام کو میرا کبر حسین کا انتقال ہو گیا آہ کے ساتھ بربہ ہاتھ سے نیچے گر گیا میں ایک حالت گم شدگی میں اس شعر کو پڑھ کر رُوح سے مخاطبت کرنے لگا۔

رفتی داز رفتت یک عالمے تار کشید تو مگر شمعِ جو رفتی بزمِ برہم خستی
شام کو عشرت منزل پہنچا مولوی سید عشرت حسین صاحب اور خواجہ جن نظامی صاحب موجود تھے۔ خواجہ صاحب تار پا کر آج ہی دن کے اکیس بجے پہنچ گئے تھے فرمایا کہ میں پہنچا ہوں تو گویا بے مفقود تھی مگر میرے ہاتھ چھوئے اور دُعا پڑھنے پر اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو دباتے جاتے تھے جس سے پتہ چلتا تھا کہ جس باطنی موجود بھی میں نے اندر جا کر میت کا چہرہ دیکھا سر کے بال اُتار دیے گئے تھے اب بھی معلوم ہوتا تھا کہ نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں دل بھر آیا زیادہ دیکھا نہ گیا مولانا محمد کافی صاحب نے میت کو غسل دیا اور ناز جنازہ پڑھائی نماز میں تقریباً سو اور بعد کو جنازے کے ساتھ ۴۴ نفوس تھے ان میں ڈاکٹر شاہ سلیمان صاحب اُن کے مخصوص ملنے والے تھے۔ قبرستان کے بعد بارش کے خوف اور تاریکی کے باعث لوگ زیادہ شریک نہ ہو سکے چار گیس لائٹوں کا انتظام تھا کالے ڈانڈے

کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ میرے بھائی حافظ حکیم نجم الدین مرحوم کے پوتے عاشق حسین نے اور بھانجوں نے قبر میں آثارِ قبر صندوقی قبی اس پر تھیر کی سلیس رکھ دی گئیں۔ ہائے اس کے بعد سے
 منجھوں میں خاک لے کر لوگ آئے بعدِ دفن زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
 (نائب)

رات کے اربعے مرحوم کو قبر میں چھوڑ کر ہم سب واپس آئے میرا ایک شعر میرے
 عقبی میں صرف توشہ اعمال ساتھ ہو دنیا میں سارا رہ گیا سامانِ زندگی
 عشرت منزل پر واپس ہونے کے بعد عاشق حسین سے معلوم ہوا کہ مولوی
 عشرت حسین صاحب آپس کے فساد کو رفع کرنے کے لیے وعدہ کیا ہے کہ تنازعہ امر
 ثالث مقرر کر کے طح کر دیے جائیں گے اور آٹھ ہزار کی رقم جو مرحوم نے بنک
 میں چھوڑی ہو آپس میں حصہ رسد تقسیم کر لی جائے گی۔ عاشق حسین سے یہ معاملات
 من رہا تھا اور مرحوم کے اس شعر کو ذہن میں دہرا رہا تھا
 کوئی مرے تو دیکھ کر کیا لے گیا وہ ساتھ بے کار ہے یہ بحث کہ وہ چھوڑ کیا گیا
 دوسرے دن شام کو عشرت منزل گیا مولوی عشرت حسین صاحب، نوح نارو
 صاحب اور راجہ میاں صاحب سے ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب
 دہلی واپس چلے گئے اربسمبر کو سیوم کے واسطے چار حافظوں کو ساتھ لے کر
 صبح عشرت منزل گیا اکثر نفوس شریک فاتحہ سیوم تھے زیادہ تعداد محمد کافی
 صاحب کے مدرسہ کے طلبہ کی تھی۔ پانچ کلام اللہ ختم ہوئے۔ مولوی ابو محمد صاحب
 نے تاریخ وفات کا مادہ سنایا

کہ ساکت شد لسان العصر اکبر

میں نے بعد کو غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مادہ غلط ہے اس میں دوسو کے بقدر اعداد

زیادہ ہو جاتے ہیں -

۵ اترتمبر کو مولوی سید عشرت حسین صاحب نے حسب ذیل تاریخیں جانچنے کو دیں تمام درست پائیں -

(۱) محرم میں لسان العصر اکبر بھی جہاں پہنچے ۱۲ھ از گوہر صاحب

(۲) مل گیا وہ آج ذات پاک میں ۱۳ھ از شیر علی صاحب شاعر

(۳) لسان العصر اکبر حسین صاحب اکبر ادیب حج الہ آبادی ۱۳ھ

(۴) تاریخ وفات اکبر ۲۱ ۱۹ھ از حاجی سید احمد صاحب
فرستادہ الف دین صاحب دکیل

(۵) ہی پہنچا آج اکبر رحمت اللہ اکبر میں ۱۳ھ از محمد اسماعیل صاحب مدرس

(۶) دیکھ اکبر مر گیا برپا قیامت ہو گئی ۱۳ھ از محمد ہادی صاحب

۶ ستمبر کو مولوی سید عشرت حسین صاحب پر تاب گڑھ چلے گئے غرض کہ وہ
شمع کے محل ہوتے ہی پروانے سب نصرت ہو
وفا کیا تا مباد ان انجمن کیسا ہو گیا

باب پنجم

تنقید کلام

ابتداءً میرا خیال تھا کہ چونکہ کلام اکبر پر اس سے قبل ریویو مختلف رسائل وغیرہ میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں، اب اس کا اعادہ نہ کروں مگر بعض سخن فہم حضرات نے اصرار کیا اور بالخصوص مکرمی جناب ہاشمی صاحب نے مشورہ دیا کہ اس تالیف کی تکمیل کے واسطے اس باب کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا اب اُن پہلوؤں کو بچاتے ہوئے جن پر سابق میں روشنی ڈال چکا ہوں، مثلاً فلسفیانہ خیالات عارفانہ نکات، اخلاق و مواعظت، مناظر قدرت، شوخی و ظرافت، اظہار فطرت، زبان کی سلاست و روانی، عاشقانہ شاعری و تغزل وغیرہ اور اُن خاص خاص سرخیوں کو چھوڑتے ہوئے جن کا حوالہ دیا چہ میں دے چکا ہوں کلام اکبر کے کچھ دوسرے نمونے اور اُن کے متعلق اپنے خیالات پیش کرتا ہوں۔

ظفریات | ظرافت کی طرح طنز و تشنیع اکبر کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر گدانا ہو یا جھکی لینا دونوں مقصد براری کے آلات ہیں۔ اور مواقع کے فرق کے ساتھ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ بشری فطرت ہے کہ مجبوراً انسان طنز کے طعنے چلا کر دل ٹھنڈا کرتا ہے۔ عورتیں اس میدان کی خاص مرد ہیں۔ قدامت و متاخرین میں مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس حربہ طنز سے اکبر کی طرح خوبی اور کثرت سے کام لیا ہو۔ اکبر کی تشنیع میں آپ گریو گان کی سی کم وقتی یا بے کسی کہیں نہ پائیں گے۔ بات کو ہم بناؤ اور الفاظ کو بجلی کی طرح گرانا

ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ طنز کے معاملے میں ان کی گفتار کی گرمی اور کلام کی جگر تنگانی ملاحظہ فرمائیے۔

ذہن عالی اور ہر جمعیت دل اور ہر علم منزل اور ہر اور قرب منزل اور ہر
اس مفہوم کو کہ انسان کو دماغ سے زیادہ دل اور عقل سے زیادہ ذوقِ صبح کی
ضرورت ہے ایک دوسری جگہ اس طرح بھی صاف کیا ہے کہ
خدا طالب نہیں تم سے متقی بات کرنے کا وہ اس سے خوش ہے جس کو شوق ہے حیرت کا

ہمیں تو خامشی میں اپنے دل سے کام لینا ہے۔ زبان وہ بزم میں کھولیں جنہیں انعام لینا ہے
نہایت خوشنما کھولی ہیں ابھی آپ نے لیکن وہ رکھیں پاؤں جن کو اپنے سر الزام لینا ہے
صنعت تضاد اور مرعۃ النظر کے سلسلے میں دیکھیے کہ اکبر کو غصہ میں بھی ”سر“ اور
”پاؤں“ کا کیسا ہوش ہے۔

مبارک ان کو جو حالات طبقات میں سمجھے پہنچ وہ بھی گئے زیر زمین جو کچھ نہیں سمجھے
زیر زمین پہنچ جانے کا اشارہ کتنا بلیغ ہے اس ”معلوم شد کہ پہنچ معلوم نیست“ کو دہری
جگہ یوں ظاہر کیا ہے کہ

ڈاکٹر تجربہ کرتا تھا ہوا میں رخصت مجھ سے وہ کہنے لگا آپ کہہ رہے ہیں
کہہ دیا میں نے ہوا تجربہ مجھ کو تو یہی تجربہ ہونہیں پاتا ہے کہ مر جاتے ہیں

کہاں اور کس طرف قائم کر دو گے یادگار ان کی
دیم آخر یہ ذکر ان سے کرو لیسین کیا ہوگی

ظاہر میں خود پسند اور دنیا زدہ لوگوں پر دوسری جگہ انوس ملاحظہ ہو کہ
ماسٹر ہیں نزع میں لڑکوں کی حالت دیکھیے ان کا فوٹو لیتے ہیں بڑے نہیں لیسین لٹے

دل میں خاک اُڑتی ہو خالی اہم دل دیکھیے مذہب اپنے نصت ہی میں پیچ مذہب دیکھیے

دو نرخ کے داخلہ میں نہیں اُن کو عذر کچھ نوٹو کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند خوب کہنا اور ہی اور خوب ہونا اور ہی

چیز وہ ہر بنے جو یورپ میں بات وہ ہر جو پائیر میں چھپے

فقط سڑکوں سے تسکین نگاہ چشم شرقی ہو اندھیرا ہی گھروں میں استوں میں لمبی پتی ہو

میری نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سنا یہ تو کہیے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہو

الفاظ کا انتخاب اور جل بھن کر کہنے کا اسلوب دیکھیے معلوم ہوتا ہو کہ شعر کی بجائے
منہ سے آگ نکل رہی ہو۔ جام جمشید کو کاسہ گلی اور کاسہ گلی کو جام جمشید یوں بنایا
جاتا ہو۔

میں کب کہتا ہوں اور واغظ کہ میں نے کار دیں سمجھا

مگر اتنا سمجھتا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

بطان جس کو کسی لطیف چکی لے کر ظاہر کیا ہو

خدا کے فضل سے بی بی میاں و نون ہتھ ہیں

حجاب اُن کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

احساس کے باطل ہو جانے کے اسباب بھی قابل خیال میں فرماتے ہیں

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا اُن کو کام

ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

گزر ہو ان کا کیوں کر حلقہ اللہ اکبر میں رہے صاحب کے بنگلے پر مے صاحب کے دفتر
 ”اہل تدبیر کی دامانگیاں“ دیکھیے
 میری سمجھ میں تو یہی آیا نظر کے بعد تحقیق علتوں کی یہاں ہی خبر کے بعد

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا
 حقائق نگاری | انیسویں صدی کے حقائق نگار مفکرین میں حالی کے بعد صرف
 اکبر پر نظر جاتی ہے۔ حق بات کہنے اور قوموں کو سربلندی
 کی طرف لے جانے میں دونوں خضر راہ بنے۔ منہر مقصود تک پہنچنے کے واسطے
 راستے دونوں نے علیحدہ علیحدہ اختیار کیے۔ ایک جدت کا عاشق زار تھا تو دوسرا
 قدامت کا پرستار لیکن تنوع فکر اور بلندی تخیل سے دونوں یکساں مالا مال
 تھے۔ راست گوئی سے قوموں کو متاثر کرنے کے واسطے حالی ماضی پر مے
 تو اکبر حال پر مے کہتے ہیں۔

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں یگ بدھو وارث اسلام ہیں
 اکبر کو جدت پسند مغرب زدہ نوجوانوں سے بڑا شکوہ یہ تھا کہ ”باقی نہیں دلوں
 میں اللہ کا ادب کچھ“ اس لیے ڈرتے تھے کہ ”یہ نازنین جماعت غائب کرے
 گی سب کچھ“ اللہ کا ادب تو بڑی چیز ہے۔ اکبر کو وہ نقصا مسموم معلوم ہوتی تھی
 ”کہ جن میں عزت نام محمد ہو نہیں سکتی“ وہ اقبال کے گرو نطنے کو جس کے بخانا
 اور مجنونانہ خیال کے مطابق خدا کا انتقال ہو چکا تھا، اخلاق کا طاعون سمجھتے تھے
 اور اس تعدیہ کو روکنے کے واسطے حقائق وطن کی آگ اُچھاتے رہتے تھے کہ
 ”تم سلامت رہو اللہ نہیں ہو نہ سہی“ اور کہتے تھے
 ہر اختیار خود کو مختار تم سمجھو لیکن ہوئے یقیناً بے اختیار

راست گو اکبر باطل گوش اور عرفان سوز خیالات کو (خواہ وہ برگسانی ہوں فسطائی ہوں یا اقبالی) ادب کا ادبار کوڑھ (برص) اور عقیدے کا کوڑھ بتاتے تھے کہ ”کالج کے کیڑے پڑ گئے دلی فقیر میں“ مگر اس کو زبان کی سلاست کہیے یا حق گوئی کی طاقت کہ دشمن کو رنج کی بجائے رشک کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ انصاف یہ ہے کہ عروسِ فطرت کے چہرہ سے پردہ اٹھا اٹھا کر اُس کے صحیح خط و خال بے نقاب کرنا بڑے صاحبانِ عزم و نظر کا کام ہے۔ دیکھئے اکبر کی نگاہِ عمیق نے کس کس طرح علم و حکمت کے آنکھوں کا کھوج لگایا ہے جہاں تک ہر شخص کی نظر بالکل نہیں پہنچتی۔

علمائے فلکیات کا اعلان ہے کہ فضا کے بیسٹ کا عمق لاکھوں سالوں میں ہمارے نظامِ شمسی جیسے لاتعداد نظام ہیں اور آفتاب سے کروڑوں گنے بڑے دوسرے سورج اپنے مطیع ستاروں اور اقمار کے ساتھ گشت لگا رہے ہیں ہمارا نظامِ شمسی خود سماں کی طرف ۱۳ میل فی سکنڈ کی رفتار سے کھینچا جا رہا ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سکنڈ ہے اس رفتار سے چل کر روشنی کرۂ ارض تک آتی ہے، تو نمٹوں گھنٹوں دنوں یا مہینوں میں نہیں ہزاروں سال میں فضا کی مسافت طو کر کے پہنچ پاتی ہے۔ مثلاً کہکشاں ہی کو لیجیے یہ ہم سے ایک ہزار سال دوری فاصلے پر ہے یعنی اس کی روشنی ۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے چل کر ہم تک ۹ لاکھ سال میں پہنچتی ہے۔ بعض ستارے اتنے فاصلے پر ہیں کہ اُن کی روشنی ابتدائے آفرینش سے چلنا شروع ہوئی ہے اور اب تک کرۂ ارض تک پہنچ نہیں پائی۔ ایسے بے پایاں فاصلے کی پیمائش اعداد کی مدد سے کرنا بالائے طاقت، اس کا صحت کے ساتھ خیال میں لانا بھی ایک امر محال ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اُس صدرِ نشینِ اعلیٰ جی و قیوم کی کرسی ہم سے کتنی دور ہوگی اکبر نے انسان کے علم اور خیال کی اس کوتاہی کو یوں ظاہر کیا ہے۔

بزمِ جاناں کے تصور سے رہا میں قاصر
دور کی بات تھی اندیشہ وہاں جانہ سکا
اندیشہ و خیال کے متعلق مشہور ہے کہ ہر جگہ پہنچ جانا ہے لیکن بوجہ بُعدِ مسافت
اندیشہ بھی جہاں تک نہیں پہنچ سکتا وہ بزمِ جاناں ہے۔

کم سمجھ انسان نے اپنی تفہیم کی سہولت کے واسطے گزشتہ اور آئندہ (دی
فرد) کی اصطلاحات وضع کر لی ہیں ورنہ خالقِ مطلق کے علم میں نہ کوئی چیز ماضی
ہو اور نہ مستقبل، وقت اور زمانہ کے چکر کی نہ کوئی ابتدا ہو اور نہ انتہا، یہ
دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ ہم جس واقعہ کو ماضی سمجھ رہے ہیں ممکن ہے دوسرے
شاروں کی مخلوق کے نزدیک وہ مستقبل ہو۔ سورج ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ
میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی روشنی ہم تک ۸ منٹ میں پہنچتی ہے۔ تارہ
سہیل کو لیجیے اس کی روشنی اسی مقررہ رفتار سے چل کر کرہٴ ارض تک تقریباً
سوسال میں پہنچتی ہے کرہٴ ارض پر ایک واقعہ یعنی غدر ۱۸۵۷ء تقریباً ایک سو
سال پہلے ہوا ہے اگر آئندہ سے دیکھنے کی حقیقت یہ ہے کہ نظر کسی شے کو بالراست
نہیں دیکھتی بلکہ پہلے شے کا نور آئندہ تک پہنچتا ہے اگر غدر کا منظر سہیل کی طرف
جانا شروع ہوا ہے تو ۱۸۵۷ء سے جا رہا ہے ۱۹۵۷ء میں یعنی کال ایک
سوسال بعد پہنچے گا۔ سہیل میں اگر لوگ ناظر ہیں تو ان کو ہندوستان کا غدر
اب سے یعنی ۱۹۵۷ء سے تقریباً ۲۰ سال بعد نظر آئے گا اس طرح وہی واقعہ جو
ہمارے لیے ایک صدی کی حد تک ماضی ہو گیا سہیل والوں کے لیے تاحل
مستقبل ہو گا اگر اس حقیقت اصلی کو یوں واضح فرماتے ہیں

میرے دل سے امتیاز دی و فردا اٹھ گیا
حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردہ اٹھ گیا
اور اس سہولت کے ساتھ کہہ جاتے ہیں گویا ان مطالب کو ادھر کرنا کوئی بات
ہی نہیں ہے

حضرت منصور انا بھی کہ رہے ہیں حق کے تھے دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہو
حضرت منصور کے پھانسی پانے کو جائز یا ناجائز قرار دینے پر دفتر کے دفتر لکھے گئے
ہیں، مگر اس حقیقت کا اظہار اس پاکیزہ اسلوب کے ساتھ میری نظر سے فارسی
اساتذہ میں بھی کہیں نہیں گزرا۔

مغربی دھول کا سر تک نہ پہنچا تھا اثر ایک یہ بات بہت خوب تھی عملے میں
ہنسی ہنسی میں کسی پتہ کی بات کہی ہو۔ مشرقی وضع کے قیام کا یہ ایک ایسا فائدہ ہو
جس پر اکبر سی جیسے دؤر میں کی نظر پہنچ سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ شدت موسم اور حر
دشمن سے حفاظت کے فوائد کے علاوہ عامہ کا جس کو ہم نے اپنی بد نصیبی سے
ترک کر دیا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس سے قومی دشمنی و قار کی حفاظت ہوتی
تھی۔ صاحب لوگ ہم پر ہاتھ ڈالتے ڈرتے تھے وضع کے ساتھ وقار اور عیب
بھی جاتا رہا پھر فرماتے ہیں ۛ

وضع مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی اب میں سمجھا واقعی ڈاڑھی خدا کا نور تھی
ڈاڑھی کافور ہونے کے نتائج بھی دیکھنے کے قابل ہیں ۛ

اگرچہ ریش منڈانے میں ہر صفائی تھی گناہ گار مگر بال بال ہوتا ہو
ترک وضع پر خیال آیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ایک دن
دیوبند میں چند لوگوں کے ساتھ مسجد جا رہے تھے کہ یکایک ان کا بھانجا تانگہ میں
سامنے آگیا۔ ڈاڑھی موچیں صاف، پانجامہ کی بجائے نیکر پہنے عامے کی بجائے
سر پر ہیٹ اگر ہر کلج سے چھٹی میں گھر آ رہا تھا کہ اچانک ماموں کا سامنا ہو گیا۔
حضرت ہاتھ پھیلا کر یہ کہتے ہوئے بڑے ۛ ارے تو آگیا ۛ محبوب بھانجے کو چارہ
نہ تھا اس حالت میں تانگہ سے کود کر بغل گیر ہونے کو بڑھا اس کا ٹوپ حضرت
کے ماتھے سے ٹکرایا اور گرنے لگا وہ بغل گیر ہونے سے رکا اس پر فرمایا مغربی

وضع کے ٹوپ میں اور خوبیاں ہوں گی لیکن ایک بڑا عیب یہ ہے کہ یہ دو خوشنہند
دلوں کو ایک دوسرے سے جی کھول کر ملنے نہیں دیتا۔ ہائے

پنچ شیخ سے نکلے تو پریشان ہیں اب ٹوٹی تسبیح کے دلنے یہ مسلمان ہیں اب

اطوال بیان کے خوف سے زیادہ تراشعار کی صراحت نہیں
معانی آفرینی کرتا صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ دیکھیے کیا کیا مٹا

پیدا کیے ہیں اور کیسے نکلتے بتائے ہیں

مرے عمل سے شیخ خوش ہیں نہ بھائی خوش ہیں نہ باپ خوش ہیں

مگر سمجھتا ہوں اُس کو اچھا دلیل یہ ہے کہ آپ خوشش ہیں

صف مسجد میں جو آئے نظر عزت کرو اُس کی یہ سمجھو تم اُسے اللہ کے دربار میں دیکھا

حُسنِ بت یہ ہے تو اب یا خدا کی نہیں خیر یہ ادا ہے تو نمازوں کی قضا آئی ہے

کسی کے مرنے سے یہ نہ سمجھو کہ جان واپس نہیں ملے گی

بعد شانِ کریم سے ہے کسی کو کچھ دے کے چھین لینا

بے غمِ جانِ راحت دینا ہے تو کیا ہے قاتل ہو کوئی آنکھ تو جینے کا مزا ہے

خدا کا کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

اک ادا سے کہا مسوں نے ”کمان“ تیر کی مجھ میں اب روانی ہے

Come on

جو مانگنا ہے خدا ہی سے مانگ لے اکر یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

جو مضطرب ہے اس کو ادھر التفات ہے آخر خدا کے نام میں کوئی توبات ہے

کاٹے بچھ جاتے ہیں ان لوگوں کی راہ ذوق میں

خوف آتا ہے چھری چلتی ہے ان کی میسر پر

تہذیب مغربی میں ہے بوسہ تلک معاف اس سے اگر بڑھو شرارت کی بات ہے

اُس بات کو جس کی عدم صراحت میں بلاغت ہے اکبر نے مغرب کے نقطہ نظر سے گناہ

یا جرم نہیں کہا صرف شرارت کہا ہے (You are very naughty)

کہہ کر خراب کیے جانے کی شکایت ختم ہو جاتی ہے مشرق اسی حرکت پر اقبال خطا کرتا ہے

بوسہ می خواہم از اکس تو بچہ می فرمائی گر صواب است بگو ورنہ خطائے بکنم

(جای)

بسان تیغ کبھی سرخ رویہ ہو نہ سکی عجب نہیں کہ اسی سے تفنگ پرتی ہے

بہت کاٹنے والی اور گھسی ہوئی تلوار کی تعریف میں قافی کی معافی آفرینی بھی

دیکھنے کے قابل ہے

حکیمے گفت ہر کس خون خور دلا غر شو کوں یقیم شد کہ شمشیرش بخون درن نزار آید

کہتا ہے کہ حکما کا قول سنا تھا کہ جو شخص خون پیتا ہے دُبلّا ہو جاتا ہے اپنے ممدوح کی

تلوار دیکھ کر مجھے اس قول کا اب یقین ہوا کہ یہ دشمنوں کا خون پیتے پیتے کیسی

دُبلّا ہو گئی ہے

گل تصویر کس خوبی سے گلشن میں لگایا ہے مرے صیاد نے بلبل کو بھی اُلونا یا ہے

قدر دانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے کچھ بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ اُلونے ہوئے

نا توانی میری دیکھی تو مصور نے کہا ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ

سایہ مغرب سے شوقِ دل نے پھیلائے تو یا نہ چارہ ہی دن میں گر تیلون ڈھیلی ہو گئی

دن سایہ تپلون دل پاؤ وغیرہ میں صنعت مرعۃ النظر کی جو خوبیاں ہیں وہ ایک طرف اصل معانی و مطلب داہن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہ ”جا اینجاست“

تشبیہ و استعارہ | کلام اکبر دیکھنے سے پہلے میں میر کے بیان کی خوبی اور تشبیہات کی ایسی عذرت کا قائل تھا ہے

دو تھمیں بھی جلایئے اب وقتِ فاتحہ گوری کلا تیاں سرِ مدفن اٹھائیے

اب حشر تک بہار تماشا ہوا درہم آنکھیں ہوئی ہیں بندِ منج بار دیکھ کر
کل ہی کی وعدہ خلافی سے وہ مجھ نہیں کئی شب کا ہی ملال خم گردن اُن کا
مگر

کر دیا ایمان تازہ آپ کی رفتار نے اس سے پہلے فتنہ محشر کا میں قائل تھا
اس میدان میں اکبر کے جو سر دیکھے تو ان کی تلاش اور وسیع النظری نے آنکھیں
کھول دیں کسی کا کمال فن جانچنے کے وقت صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا ہے اس
پر بھی سخت غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح کہا ہے۔ اکبر کا اسلوب بیانیہ ان
سب کو نظر آیا مگر کامیاب مقلد کوئی نہ ہو سکا۔ ان کے طرزِ فغاں پر رشک
سیکڑوں نے کیا مگر حقیقی نقل کسی سے بن نہ پڑی۔ انھوں نے اچھوتی ایجادات
جدید مصطلحات نئے استعارات اور پاکیزہ تشبیہات سے زبان کو وسیع
کیا اور آگے بڑھایا اور اپنے عہد پر پورا پورا اثر ڈالا۔ اس کے دائرہ نے سچ
کہا تھا ”زمانہ شخصیت پیدا نہیں کرتا بلکہ شخصیت خود اپنے لیے زمانہ بنا لیتی
ہے“

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں
دیکھیے کہ اکبر نے اچھی باتیں کہنے کی کن کن دل نشیں تشبیہات کے ساتھ کیسے

کیسے اسلوب بکالے ہیں ۛ

شادی کی کیا خوشی ہو غم کا بھی رنج کیا ہو
 وہ بھی تھی ایک بجلی اور یہ بھی اک ہوا ہو
 کسی ایرانی کا شعر ہے ۛ
 نہ شادی درد سامانے نہ غم آورد نقصانے
 پیش بہت ماہر کہ آمد بؤد ہمانے

مرے ساز و سخن پرست فطرت کو مستغض ہے
 پیانوبے سُر اُبھا گیا بزمِ شغلاں میں

مواقع دیکھ کر اظہارِ مردی چاہیے اول
 ڈرائیں کھیل میں بچے تو ڈھٹا ہی تہرے
 ایک ایرانی نے بھی اسی خیال کو ادا کیا ہے کہ اگر بوڑھا باپ بچے کے ساتھ کھیلے میں
 بچے کی سی تو ملی زبان استعمال کرے تو یہ امر اُس کی نادانی پر محمول نہ کرو
 عاقل داند کہ اُس پر رکود ک نیست

قوم ضعیف تنگ ہو چیدں کی ٹانگ سے
 کلج کے چوٹے پٹے میں مڈی کی ٹانگ سے

نہ قوم کی تمہیں الفت نہ قوم کا ہو وجود
 نقطہ یہ پولیٹیکل انحرات کا ہی صعود

جھادنی میں رہیں صاحبِ تو میں لیڈر بھی
 یعنی کیوں ساتھ سلیمان کے ہمدرد نہ رہی

ہزار دُور ہوں اپنے جہ میں ۛ ہانپنے میں
 کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہِ جدا

رزو لیوشن کی شورش ہے مگر اُس کا اثر قاتل
 پلیٹوں کی صدا سننا ہوں اور کھانا نہیں آتا

مولوی گو کہ ہیں شمس العلماء پھر بھی ہست
 رنگتے پھرتے ہیں پُرانے بے شب کی طرح

بھروسہِ باغ ہستی میں نہیں کچھ نخلِ قامت کا
 نص کیا ہے ہوا کی بیل ۛ دھوکے کی مٹی پر

چال دنیا کی تمہیں محسوس ہو دشوار ہے
 یہ زمیں چلتی ہو تیزی سے مگر ہلتی نہیں

بولے وفا نہیں ہر مسوں کے اصول میں بس رنگ دیکھ لیجے گلے کے پھول میں

ہر سچا پوہر طرف مرکز مگر کوئی نہیں فریجہ ہم لے رہے ہیں مادر گھر کوئی نہیں

بتوں سے میل خدا پر نظریہ خوب کہی شب گناہ و نازِ سحر یہ خوب کہی مضمون وہی پُرانا ہے کہ سہ

میری بھی ہوٹل میں سوچندہ بھی دو سحر میں شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی ناراض نہ ہو

شیخ سچ یادش بخیر شیخ کے تذکرہ نے اس طبقے کی نسبت اکبر کے دوسرے خیالات تازہ کر دیے۔ یوں تو کون ایشیائی شاعر ایسا ہے

جس نے اپنی نوک قلم سے ان لوگوں کو کچوکے نہیں دیے میں لیکن اکبر نے ان کی جتنی کمزوریاں طشت از بام کی ہیں اور جیسے جیسے دل کے چور کپڑے ہیں وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ علامہ مشرقی اور علامہ نیاز نے اس گروہ کے نقاب اٹھ جانے کے بعد کے حقائق کچھ کم کوشش سے نہیں دکھائے مگر نتیجہ کیا نکلا تلخی گفتار سے دشمنی بڑھ گئی اور بقول اکبر ڈھائی کے ساتھ۔ ع

نقاب الٹ ہی دی اُس نے کہہ کر کہہ کر ہی لے گا مراموکیا

اکبر نے بھی ان کا ایک ایک عیب چن کر بتایا ہے مگر ایسی زندہ دلی اور بندہ سخی کے ساتھ کہ ان کو زندگی بھر اپنے خلاف جہاد کرنے کا موقع نہ دیا فرماتے ہیں کہ شیخ لکیر کے فقیر ہیں اور حالات کے لحاظ سے اپنے علم کو بڑھانے اور تبلیغی سعی کرنے

سے باطل قاصر ہے

شیخ ثلث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ گھر میں بیٹھے ہوئے وائٹین پڑھارتے ہیں

شبلی مرحوم نے بھی شیخ صاحب کی ہی دکھتی ہوئی رگ پکڑی تھی جس پر برہم ہو گئے تھے

بولے کہ خبردار یہ کیا سوئے ادب ہے کرتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بے کار نہیں
 شیخ صاحب نے متواتر دیکھا کہ بیمار کے سر ہائے آخر وقت یسین شریف پڑھتی رہتی تھیں
 کا دم سہل نکل جاتا ہی اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ یسین ایک دم گھوٹنے والا کس چیز
 یسین کا اثر انسان کو جلد ختم کر دینے کا مرادف ہی تو اس کے درد سے بیٹھے بھاگ
 اپنی جان عزیز کو خطرہ میں کون ڈالے نہ بانس ہو گا نہ بانسری بجے گی سہ
 شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا اُس اس واسطے رکھتے ہیں یسین کے تھ
 ہمارے اکثر قدیم خیال بزرگوں کو حالیہ حقائق اور تجرباتی علوم کی ہوا نہیں
 لگی مگر ان کا منہ ہی کہ جس حقیقت کے خلاف چاہیے کھلوا لیجیے۔ ایک مولوی صاحب
 مقرر تھے کہ جغرافیہ کو نصاب تعلیم سے خارج کر دینا چاہیے اس سے کیا فائدہ ہو
 کہ جھیل ساٹھ راجپوتانہ میں ہی اور بانسور تبت میں ایک دوسرے بزرگ کو
 اس مسئلہ پر ضد کرتے دیکھا کہ تیاروں کے فاصلوں کا تعین ایک یورین گپ ہی
 خود چونکہ واقف نہیں اعلیٰ ریاضی اُن کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی۔
 ان لوگوں کو اعتراف چل کرتے ہوئے شرم آتی ہی اور اپنی عدم واقفیت کے
 باعث بہت سی غلطیاں کر جاتے ہیں دیکھیے اکبر نے اس کا کیا لطیف نوٹ
 لیا ہے

نا تجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ تہیا اس رمز کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہی
 غالب کے نصاب تعلیم میں سبق الاشیاء کا مضمون داخل نہ تھا وہ
 اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ سور کے پنجے ہوتے ہیں یا کھر اس وجہ سے
 اپنی ایک مثنوی میں دشمن کی نسبت کہ گئے۔ ع

خوک شد و پنجہ زدن باز کرد

جب اہل کلکتہ نے اعتراض کیا کہ ”مرزا خوک پنجہ ندارد“ تم نے کبھی سنا

دیکھا بھی ہو تو زمین شخص تھے یہ جواب دے کر خجالت مٹائی بھائی ہیں بوڑھا ہو گیا،
 میں نے تو اس نجس جانور سے اب تک معر فی حاصل نہیں کی جس کو ضرورت ہو
 اس سے تعارف بڑھائے مگر معترض کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہا کہ نا تجربہ کاری
 سے غالب کی ہیں یہ باتیں، اکبر اعظم کے دربار میں عبدالغنی صدر الصدور نے قائم
 کوہی کو اس کی اس رباعی پر یہ کہہ کر سخت پکڑا کہ ”ایں اہانت دین است“ ۵
 ہر کس کہ از اسرار خدا کا بہت ۱ پیوستہ میاں بنگلہ نشں ۱۷ بہت
 از بنگ شود ستر انا لحن ظاہر چوں ہر برگش بہ صورت اللہ بہت
 قاسم نے اکبر سے بقول اکبر الہ آبادی یہی کہا کہ حضور صدر الصدور صاحب سے
 بنگ کے بارے میں ”پوچھو تو کبھی پی ہی“ صدر الصدور کو اکبر کے اصرار پر کہ
 جواب دو کہنا پڑا کہ استغفر اللہ پنا کیا میں نے کبھی بنگ کی تہی کی نسل بھی نہیں دیکھی
 ہو اور قاسم کوہی کا اعتراض حسب حال بحال رہا کہ سع

نا تجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں

شیخ صاحب کو اس پر غرہ ہو کہ ہم بُت شکن ہیں اور خدا کے سامنے سر کو زمین پر
 رکھنے والے حالانکہ سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہو کہ سع

آل را بہ زمیں نہ کہ در سرداری

سبب ان کا تو ہو ظاہر خدا پر خودی دل میں

بتان سنگ لٹوئے بُت پندار باقی ہو

”چاہہ زمزم کے مینڈک“ کی بھی یہی حالت ہو ۵

غرطے تو لگائے زمزم میں اور غرق ہیں حُب دنیا میں

پانی سے بدن کو پاک کیا اب جان کو طہر کو نہ کرے

عرفان کم گوئی، کم خوابی اور کم خوری سے حاصل ہوتا ہے لیکن جن مشغولین

کی ”خوراک ڈھائی سیر“ ہو وہ اپنے کھانے کو دیکھیں دوسروں کے پینے کو دیکھنے کا انھیں کیا حق ہو۔

زندگی سے میرا بھائی سیر ہو پھر بھی خوراک اس کی ٹھائی سیر ہو
مجھ کو خوش کرتی ہر مستی شیخ جی کو فرہی میں ہوں پینے کے لیے اور وہ ہیں کھانے کے
حلوائے سفنقور از دیاد قوت ۰۰۰ کے لیے ہوس پیشہ امر کی خاص غذا ہے
شیخ صاحب بھی اس کا خاص شوق رکھتے ہیں اس لیے کہ لذت کے علاوہ یہ مکرر طاقت بھی بخشتی ہو۔

شیخ صاحب کی کمرچمک گئی پر دل نہ جھکا آج تک شوق سفنقور چلا جاتا ہو
شیخ کے گڑ کھانے اور گلکلوں سے پرہیز کا یہ عالم ہو۔
خلافت شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں مگر اندھیرے آجائے میں چوکتا بھی نہیں
شیخ صاحب مذہب پر صرف اس وقت تک عامل ہیں جب تک پیٹ کا دھندا اچھا چلتا ہو۔

خوشی سے شیخ کالج سوئے مسجد اب نہیں چلتا
جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا
کالج سے نکل کر شیخ صاحب کو فوج میں نوکری مل جاتی ہو تو ایسی مکر دھندا انجام دیتے ہیں۔

برگنڈ کے مولوی کو تم جانتے ہو کیا ہو انگلش کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہو
موجودہ تعلیم پر نکتہ چینی آج کل حاملان عقل و رائے کو متواتر تحریروں نے
سبب حالیہ تعلیم کا نقص ہو جو مشاغل صاحبان دولت و ملک کے لیے زیبا ہیں
وہ ناداروں کی زندگی کا جزو بن گئے ہیں۔ یہ مروجہ تعلیم ہی کی خرابی کا باعث

ہر کہ رئیس تو رئیس ہر غریب اُس رئیس کو اختیار کر رہا ہے جو اُس کی حیثیت سے انجی اور اُس سے بچنے والی نہیں۔ غیر مالکان مال و جمال ہیں اور ہم فاقہ مستیوں کی مثال۔ ہمارا عسرت زدہ گھر تخریب کا نمونہ ہے اور ہمارا دل مغربی تہذیب کا دیوانہ۔ ہماری مشرقی معیشت کا یہ حال کہ ہے

کونے کونے میں گھر کے جالے ہیں اور ہم سوٹ کے حوالے ہیں
ہماری حیات و حرم کی ملکہ آج مشاغلِ کلب میں مصروف ہے وہی جو کل ملک
دل کی شہزادی تھی آج کنیز آزادی ہے

انقلاب دہرنے بیگم کو آیا کر دیا خود پری تھی اُس پہ اب پریوں کا سایہ کر دیا
ہم کو دعوتیں کھالے کا شوق ہے فاقہ زدہ اقربا کا غم کھانا ہم نے بالکل چھوڑ دیا۔
خیال سعی و محنت کو گھٹا کر ہم نے شان و عزت کے احساس کو بڑھالیا ہے۔ ہم تقریریں
اور مشاعروں کی واہ کو دیکھتے ہیں غم زدہ خاندانوں کی آہ کو نہیں دیکھتے۔ بدست
میں ہم نے ناز آفرینی کا ایک ایکٹ کر لیا تو سمجھ لیا کہ شخصی اور قومی فلاکت کا داغ
مٹ گیا غرض کہ ہے

ہر طرح قوم ہو چکی بدنام	اب تو مایہ ہے مایس اور نہ رام
بس نئے دھائی اور دھاک کھیں	ہم نہ گھر کے ہیں اب نگاہ کھیں
لوگ اچھے عمل پہ مرتے ہیں	آپ ٹماکی کی ٹماک کرتے ہیں
ہر پدر مرغِ بسل دے پر	آپ کے ہاتھوں اڑ رہا ہے زور
آپ پر بھی ہے ان کی خدمت فرض	ہر بڑھایا جنھوں نے لے کر فرض
گھر میں کون آکے اب بٹائے ہمارے	آپ جاتے ہیں اہل بیچ کے ساتھ
آپ نے اوڑھ لی تن آسانی	کون دے ماں کو اک گھڑا پانی
چھپکے بیٹھا ہے فرض خواہ سے ہمارے	جاہے ہیں مشن کے چرچ میں آپ

بچے سب صبحک سے میوانے ہوں آپ ہوں اور چائے خانے ہوں
یا ترکِ عمل کی گھاتیں ہیں قال تک ہسٹری کی باتیں ہیں
ہر یہ تقریر مدرسہ کا اثر تختہ مشق ہر وقار پدر
ماں چلتی ہر یوں زباں فر فر جس طرح رُخ پہ سیفٹی ریزر (قمر)

ہمارے جد مجاہد تھے اور باپ غازی، ہم کو اور ہماری اولاد کو دیکھیے تو
دیرینہ بے نمازی - ہماری نوک زبان پر برج (تاش کا جوا) کے قواعد ہیں
اور یہ حساب کہ کون کتنا جیتا۔ اب نہ پیش نظر احکام قرآن و گیتا ہیں نہ اخلاق
رابعہ بصری و سبتا۔ ہم بیچ کی کامیابی و نامیابی جانتے ہیں، دیونفس پر وار کرنا
بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ طعن و ذلت کا اندیشہ نہ صنعت سیکھنے دیتا ہے نہ پیشہ۔
شوقِ عسکریت کی جگہ نازن سائیت نے لے لی ہے۔ جوا بھگلیاں تیغ کی دھار
دکھتی تھیں وہ اب وقفِ تار ہیں۔ شوقِ غلامی اب تمام دفاتر کے آستانوں کی
سلامی کرانا ہے، ہم جو کچھ سیکھتے ہیں وہ محض کتب و قال سے نہ کہ صاحبانِ کیفِ حوال
سے۔ اکبر نے تعلیم کی اس خرابی پر آنسو بہائے ہیں کہ سہ
لفظ تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی آدمی بناتے ہیں

افسوس سہ

سیکھتے ہیں ہم آج بات کچھ اور اور ہر مقصدِ حیات کچھ اور (قمر)
(۱) روشن خیال طبقہ تعلیم کی جن خرابیوں کا آج اظہار کر رہا ہے دیکھیے اکبر نے
آج سے نصف صدی پہلے اُن کے خلاف کیا آوازہ مخالفت بلند کیا ہے۔ اکبر کا
یقین ہے کہ حالیہ تعلیم ہم کو وہ ڈھب نہیں سکھاتی جس سے زندگی کامیابی کے ساتھ گزری
جاسکے۔ فرانس کا مشہور قائد اور ادیب روسو کہا کرتا تھا کہ ارسطو کے تمام فلسفیانہ
اور اصولی ذخائر کے مقابلے میں مجھے ڈنیل ڈی فوکے وہ علمی تجربات زیادہ

گراں قدر معلوم ہوتے ہیں جو اُس نے اگلز نظر سلکرک کے پردے میں دنیا کو سکھایا
ہیں۔ اکبر بھی یہی کہتے ہیں کہ دنیا کو خیالی شیخ چلیوں کی ضرورت نہیں، اس کو اب
باعل شہری درکار ہیں۔

شیخ صاحب کو ہر بڑا دعوے اونٹ کے سولفات جانتے ہیں
ہیں مگر اونٹ پر نہیں قابض کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں
(۲) فرماتے ہیں کہ میکالے جیسے اشخاص نے موجودہ تعلیم کی داغ بیل کھسی
اس خیال سے ڈالی تھی کہ ہم کلرک بنیں اور کمپنی کو سستے عمال اور مرغ آئیں ملازم
ہمدست ہو سکیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ ہم ناکارہ خود پسند بے ادب لاندہب
بد اخلاق اور کاہل ہو گئے ہیں۔

تعلیم جو دی جاتی ہے وہ کیا ہے نری بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیسا ہے فقط سرکاری ہے
(۳) دو محرک بچے کی زندگی پر خاص طور پر موثر ہوتے ہیں ایک ماں کا
دودھ جو ارثی اثرات ڈالنے بغیر نہیں رہتا، دوسرے ابتدائی تعلیم جو
افراد مزاج مرتب کرتی ہے۔ مغرب نے ہم کو بگاڑنے کے واسطے پہلے ان
دو محرکات کو اپنے بس کا کر لیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوام کے بگاڑنے کے یہی
اسباب ہیں۔ رومائے زوال کے سلسلے میں تاریخ کا یہی اعلان ہے کہ ”زمانہ“
عرفی رومائے پیدائش سے چھو سال تک بچوں کی متعلقہ ان کی ماں ہی ہوتا
کرتی تھی۔ یہی اپنا دودھ پلا کر بچوں کے اندر زبان، خیالات اور اخلاق کی
بنیاد ڈالتی تھی بعد کو جب سلطنت رومایونان میں گھن لگا تو اس خرابی کا ایک
بڑا سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدائی پرورش اور تربیت اطفال کا کام
راحت دیدہ اور نعمت چشیدہ ماؤں نے بالکل چھوڑ دیا۔ بچے پیدا ہونے ہی

ذیل دودھ پلانے والی اناؤں اور معلومات کے حوالے کر دیے جاتے تھے اس سے رومیوں کی نئی نسل کی عمارت اخلاق ٹیڑھی ہی بنتی رہی اور بالآخر منہدم ہو گئی، بقول مولانا رومؒ

خشتِ اول چوں نہد مسمار کج تا فریامی رسد دیوار کج
مشہور یونانی رہبر کیٹو نے اپنے لڑکے کو خط میں لکھا تھا "میرے کہنے کو ارشاد پیغمبری سمجھ کر اس پر ایمان لاؤ اور یقین جانو کہ یونانی ناقابل اصلاح حد تک ناکارہ ہو گئے ہیں۔ اگر ان کی راحت پسندی اور بانگین نے ہم میں گھر کر لیا تو سمجھ لو کہ ہماری قوم کی قسمت پھوٹ گئی" اکبر مرحوم نے ان سب باتوں پر کامل غور کرنے کے بعد ایسا حکیمانہ مطلع کیا ہے

طفل میں بوائے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبہ کا ہی تعلیم ہے سرکار کی

اسی لیے لڑکوں کو مشورہ دیتے ہیں

کالج میں بگڑ جاؤ گے دسواں ہی ہے تم پاس رہو میرے بڑا پاس ہی ہے
(۴) درسگاہوں میں جو کتب پڑھائی جاتی ہیں ان میں تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو کے مسئلے کو ضرور ملحوظ رکھا جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان بچہ سیواجی کو ایک شفاک لیٹر سمجھتا ہے اور سرسندھو طالب علم یقین رکھتا ہے سرخ کہ عالم گیر منہد کوئی تھا ظالم تھا ستم کرتھا

یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے فرقہ داری نزاعات کبھی ختم نہیں ہوتے اس حقیقت پر نظر کرنے والے بہت کم ہیں کہ مغرب کے تعلیمی انجکشن نے ہندو مسلمان دونوں کی حالت بالکل بدل دی ہے اب نہ ہندو ہندو رہا، نہ مسلمان مسلمان۔ اس پر اکبر کا تبصرہ دیکھیے

پنڈت نے خوب بات کہی جوش طبع میں ناحق قدیم عہد پر یوں طعنے زن ہیں آپ
 پتھر کے بدلے اب تو دھرم ٹوٹنے لگے محمود بت شکن تھا برہمن شکن ہیں آپ
 اکبر کی ذہانت دیکھیے کہ خود خواہ کیسے ہی حال شرع اور واقف تفسیر ہوں،
 یہاں چڑکے ہندو دھرم کا معاملہ تھا حق بات پنڈت کے منہ سے کہلوائی وہ
 بھی جوش طبع میں - ع

جوستا ہر وہ کہتا ہے کہ کہنا اس کو کہتے ہیں

(۵) فرماتے ہیں موجودہ تعلیم نے ذہنوں کو جلادے دی ہے مگر لطیف جذبات
 کو بالکل ماند کر دیا۔ عقلیں تیز ہو گئی ہیں تو ایمان ضعیف۔ ظاہر برسرِ فرغ ہے تو
 باطن مُردہ، ذاتی خود غرضی نے ملی مصلحت و عزت کو بالکل مٹا دیا۔
 نئی تعلیم میں تقویٰ کا وہ اکرام کہاں ناز بے حد ہے مگر غیرت اسلام کہاں
 (۶) مذہب ایک اعتقاد ہے جو روایتی نہیں اس کا تعلق ذوقِ سلیم سے ہے
 حجت و فلسفے سے نہیں۔ آج کل کی تعلیم نے اسی نکتہ کو فراموش کر دیا ہے۔
 مدرسہ خدا کا علم بچے کے دماغ میں کانوں کے ذریعہ پہنچاتا ہے، آنکھوں کے
 ذریعے نہیں۔ اسی لیے دینیات و اخلاق سکھانے کے واسطے اربابِ تعلیم
 نے مستقل کتابیں داخلِ نصاب کی ہیں اور اق فطرت کھولنے کے بجائے طلبہ کے
 سامنے درسی کتبِ اخلاق کے صفحات پیش کیے جاتے ہیں حالانکہ نظرِ انصاف
 سے دیکھیے تو یہ

ہسٹری کی کیا ضرورت دین کی تعلیم کو انجم و شمس و قمر کافی تھے ابراہیم کو
 (۷) مضامینِ نصاب کی اہمیت اور عدم اہمیت ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے
 ہر عہد میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے کبھی کوئی مصنوعی غیر ضروری سمجھا جاتا تھا کبھی کوئی
 کبھی کسی کو ترک کیا جاتا تھا کبھی کسی کا اضافہ کیا جاتا تھا کسی زمانے میں کسی مصنوعی

نصاب پر زیادہ زور دیا جاتا تھا کسی عہد میں کسی پر۔ آج کل اخلاق و مذہب کو جوانانیت کی جان ہر باطل پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس کے لیے ہفتہ کے ۲۲ گھنٹوں میں سے صرف دو گھنٹے فی ہفتہ دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصاب کے اس تقار خانے میں اس طوطی اخلاق کی آواز کیا سنائی دے۔ دیکھیے اکبر نے اس اعتراض کو کس نا در تشبیہ کے ساتھ پیش کیا ہے فرماتے ہیں ۷

نئی تعلیم میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہو مگر ایسی کہ جیسے آپ زمزم میں منہل ہو
(۸) مغربی تعلیم کا جتنا اثر ممالک مشرق میں بڑھتا جاتا ہے، باہمی خلوص و ایثار کا
کامن اور پیار گھٹتا جاتا ہے۔ اس اثر نے ممالک مشرق کی روحانی محبت باطل نصرت
کر دی۔ خدمت و رافت کی جگہ حد و نفاق نے لے لی ہے۔ یہ مضر اثرات ہندوستان
سے لے کر عرب تک روز بروز روشن کی طرح عیاں ہیں ۷

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی لیکن وہ مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی
(۹) دالمیان فرنگ نے اہل مشرق کے دل میں یہ بات پورے طور پر اتار دی ہے
کہ فارسی، سنسکرت یا عربی وغیرہ قدیم اور اڑکار رفتہ زبانیں ہیں اور دنیا میں
اجرائی ضرورت کے لیے بالکل بے کار اس لیے بہتر ہے کہ ترقی خواہ قوم عربی
کی بجائے انگریزی پر توجہ کرے کیوں کہ یہ ایک زندہ اور موثر زبان ہے ۷
شیطان عربی سے ہے ہند میں بے خوف لاجول کا ترجمہ کر انگریزی میں
اس مغربی اغوا کے باعث مسلمانوں نے عربی کی جانب توجہ کرنا بالکل
چھوڑ دی اور ظاہر ہے کہ عربی کا چھوڑنا اپنے قومی شعار اور دینی کردار کو بالکل
لیا میٹ کر دیتا ہے ۷

مسلمانوں کا وہ آئین طبع منتقل بدلا گئی عربی چٹھا قرآن زباں بدلی تو دہلا
(۱۰) علم ایک قوت ہے اہل مغرب نے اس کو ہمارے خلاف اس دانائی سے

استعمال کیا ہے کہ ہم کو ہمارا نقصان اب تک نہیں معلوم ہم حاکم سے محکوم اور آزاد سے غلام ہو گئے لیکن اس پر خوش ہیں ۷

گو لاکھ بے وقار ہوں بڑھو کو غم نہیں کافی ہے یہ شرف کہ دفائی سے کم نہیں اب یہ احساس ہماری رنج میں سرایت کر گیا ہے کہ ہم بنے ہی اہل مغرب کی اعلیٰ کے لیے ہیں ایک حاکم نہ سہی دوسرا سہی ۷

ہمارا کام ہو اُس کو سلام کر لینا ۷

اس متغیرہ پست اور ذلیل ذہنیت پر خوش رہنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے۔ اکبر اسی پر روتے ہیں ۷

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں مجھے حیرت تو اُن پر ہے جو اس مٹنے پر نہیں بھر فرماتے ہیں ۷

صیاد نہ سڑکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے بیل کے لیے کیا شکل ہے تو بھی بنے اور خوش بھی ۷

(۱۱) موجودہ تعلیم نے پوری قوم کے مذاق اور تخیل کو بدل دیا۔ آج کل ۷

فکر روزی ہو رہی ہے فخر رازی اب کہاں

انجے گٹ پٹ کر لیا اور چل دیے اسکول جن سے مسجد کو تختی تھی وہ مازی اب کہاں

اسی بے اکبر طنز کے طور پر کہتے ہیں ۷

جب چالت ہے تو ذکر مسجد و مکتب فضول کہہ دو لڑکے سے خریدے یڈر اور اسکول جائے اس تباہ حالی کے باوجود اکبر مایوس نہیں ہیں۔ اصلاح حال کا نسخہ تجویز کرتے ہیں

مسجد میں خدا خدا کیے جاؤ مایوس نہ ہو دُعا کیے جاؤ

ہرگز نہ تضا کر دنازیں مرتے مرتے ادا کیے جاؤ

(۱۲) اکبر کا خیال ہے کہ موجودہ عہد میں لوگوں میں جو نائنس پسندی، فیشن

بے علی اور بد اخلاقی پائی جاتی ہو وہ سراسر نقص تعلیم کے باعث ہے۔ خدا جب
سزا دینے لگے گا تو مغرب زدہ نوجوان ہی جواب دیں گے کہ پروردگار اس میں
ہماری خطا نہیں ہمارے طریقہ تعلیم کا قصور ہے۔

مستر نقی کو عقبی میں سزا کیسی ملی شرح اُس کی نامناسب ہر ملی جیسی ملی
اُس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ اتنا س چارہ ہی کیا تھا خدا تعلیم ہی ایسی ملی
(۱۳) اکبر کے بارے میں یہ تصور قائم کر لینا کہ وہ ہر مسئلہ میں قدامت پسند ہیں
درست نہیں بعض تعلیمی مسائل میں اُن کے خیالات اُنیسویں اور بیسویں صدی
کے مخصوص جدید خیال مصلحین تعلیم سے ملتے ہیں۔ مثلاً طلبہ کو جسمانی سزا دینے
جانے کے معاملے میں وہ فرد بل اور میڈم مانٹی سوری کے بالکل ہم خیال ہیں۔
وہ اس اصول کے بالکل مخالف ہیں کہ

Spair the rod and

spoil the child یا یہ کہ

آسانی زینت نہ کیا جانے جس پر دنیا میں کڑی نہ پڑی
اُس طفل کو علم سے کیا مطلب جس پر کتب میں چھڑی نہ پڑی
وہ یقین رکھتے ہیں کہ

درس ادیب اگر بود زمزمہ مجتہ جمعہ بکتب آورد طفل گریز بائے را
اس لیے کہتے ہیں کہ استاد "اُستاد ہو تو ہو مگر اُستاد جی نہ ہو" مدرس کا کام
شفقت سے پڑھانا ہی، طلبہ بچانا یا چھڑی اڑانا نہیں۔ میڈم مانٹی سوری کا نظریہ
ہی کہ اُستاد فکر و محبت سے تعلیم دے زد و کوب جیسے مضر و مذموم ذریعہ کا
تو خیال ہی نہ کرے۔ اکبر بھی یہی کہتے ہیں کہ جسمانی سزا بچے کے حق میں مفید ہونے
کے بجائے مضر ہوتی ہے اس لیے اساتذہ سے اپیل کرتے ہیں کہ بچوں کو جسمانی
سزا دینے سے حذر کریں۔

یہ آئنی گوشمالی طفلِ مکتب کی نہیں اچھی زباں تو بے شک لاتی ہو لیکن کان جاتا ہو
 (۱۳) تعلیم نسواں کے متعلق اکبر کا خیال ہو کہ عورت گھر کے لیے بنی ہو دفتر کے
 لیے نہیں۔ وہ باپ یا شوہر کی مشیر ہو، سماج کی جاگیر نہیں۔ مغرب خود عورتوں کو
 اپنے یہاں زیادہ تعلیم اور آزادی دے کر تنگ ہو۔ ہندوستان میں عورتوں کو
 اعلیٰ تعلیم کی کسی طرح حاجت نہیں جو عورتیں اعلیٰ تعلیم پاتی ہیں وہ اپنی کمزوری صحت،
 غیر واجبی احساسِ عزت، تبدیلیِ معاشرت، کمیِ محبت، نمائش پسندی کی عادت اور
 بے حجاب فطرت کے باعث شوہر کے گھر کو گوشہ سکون و مسرت بہت کم بنا سکتی
 ہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہو کہ اعلیٰ تعلیم کا طویل سلسلہ طبقہ انات میں آزادی
 بنظر ہی اور بد اخلاقی نہ بڑھائے۔ اکبر نے انھیں خیالات کو حسبِ ذیل اشار میں ہر کیا ہو
 تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہو مگر خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

حادثہ چکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہر شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

قومی ترقیوں کی زمانے میں نہوم ہو مردانے سے زیادہ زنانے میں نہوم ہو

دو لہا بھائی کی پوریائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہو شہ
 خود کو کٹ پٹ کے لیے جان دیے دیتیں ہم سے کہتے ہیں کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

تعلیم کی خرابی سے ہوگی بالآخر شوہر پرست بی بی بیلک پسند لیڈی

اُن سے بی بی نے نچا سکول ہی کی بات کی یہ نہ بتلا یا کہاں رکھی ہو روٹی رات کی

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہو اُن کو نہایت بال میں نلچے کسی ن اُن کی پوتی تو سہی
 اپنی دین میں آبرو کی کچھ نہیں پروا نہیں نذرِ معجز ترقی ہو یہ موتی تو سہی

گھر سے جب بڑھ کر گھر کے صلیب کی کنواری نکلا
مغربی تہذیب آگے بڑھ کر جو حالت دکھا
ڈال دے گا سینہ غیرت پر میدان میں
باہر با علم و خوش رو ساختہ پر داختہ
نوجواں دکھلائی دیں گے ہر طرف لخت
منج ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو باختہ

میں بھی گریجو بیٹ ہوں تو بھی گریجو بیٹ
دو دنوں نے پاس کر لیے ہیں سخت امتحاں
بولی بیوج ہر علم بڑھا جہل گھٹ گیا
علمی مباحثے میں زرا پاس آکے لیٹ
ممکن نہیں کہ ہم سے ہو اب کوئی بدگماں
لیکن یہ کیا خبر ہو کہ شیطان ہٹ گیا

کمرے میں جو نہتی ہوئی آئی میں عشا
نقائص کلام | اس کروائڈ کے بقول کلام موزوں بالقصد کو شعر کہتے ہیں
اور کلام بالقصد متاثر ہوتا ہے شاعر کی حیات کے مدارج
سے کسی شخص کی پرائیویٹ زندگی میں کوئی نقص نظر آتا ہے تو معترض کو یہ کہہ کر روکا
جاسکتا ہے کہ ذاتیات سے بحث کی ضرورت نہیں لیکن اگر انسان شاعر یا ایڈیٹر
ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خانگی زندگی سے مکمل کرپیک میں آگیا اس کو
اگر مقرر یا شاعر ہونے کی حیثیت سے پبلک کے نقائص ظاہر کرنے کا حق ہے تو پبلک کو
بھی اتحاق پیدا ہو جاتا ہے کہ اُس کی خانگی زندگی کے مختلف مدارج کا تجسس
کرے اور اس پر کھل کر نکتہ چینی کی جائے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے
اسی لیے کہا تھا کہ اکبر کہتے تو بہت کچھ ہیں دیکھنا یہ ہے کہ کرتے کیا ہیں۔ اس طرح
اکبر پر بڑا اعتراض جو کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اُن کے اشعار و اعمال ہم آہنگ
نہ تھے۔ اس اعتراض سے پہلے اس حقیقت پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ انسان
ایک بدلتی رہنے والی مخلوق ہے۔ فیل حیات کے صرف ایک حصہ جسم یعنی مخص
کان، پائو یا سونڈ کو ٹول کر دعویٰ کر بیٹھنا کہ ہاتھی چپٹا ہے، گول ہے یا گاد دم

درست نہیں ہے۔ اگر کوئی شاعر واقعی مفکر ہو تو اُس کے خیال و عمل کے تنوع کے بلحاظ اُس کی جانب سے سطحی طور پر کچھ متضاد اقوال و اعمال کا ظاہر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ شاعر حقائق حیات پیش کرتا ہو اور نفوس قدسیہ کو چھوڑ کر ساری زندگی خود ایک تضاد ہی کہ طفلی جوانی اور پیری کے مگر کسی صورت پورے طور پر ہم آہنگ ہوتے ہی نہیں جو لوگ ظرف گلی کی بھونڈی ساخت پر بنے ہیں ان کا خندہ فی نفسہ کھا پر ہوتا ہے اور تضاد کا اعتراض مصنوع سے ہٹ کر صالح کی طرف واقع ہوتا ہے آئیں نہ جوڑ توڑ طبیعت میں کس طرح تعمیر جسم ہی نہ ہوئی سادگی کے ساتھ (تولڈا دیو نی)

اس طرح قول و فعل کے تضاد کا اعتراض میرے خیال میں چنداں قابل خیال نہ ہونا چاہیے اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تنقید کی صداقت سے بعید ہے کہ کوئی ناقد کسی صاحب کمال کے معیار سے گرے ہوئے حصّہ کلام کو اپنی قوت طبیعت سے بلند کر کے دکھائے یا اُس پر پردہ ڈال دے۔ میں عیب کو عیب کہنے پر مرحوم کی زندگی میں بھی مرکز خنکی بن چکا ہوں بقول مرحوم

مگر کو اچھا نہیں کہنے کا میں باغی تھی سچ پانی سے ہی بہتر مجھے کالا پانی میرے خیال میں ابکر کے کلام میں جو کمزوریاں ہیں اُن کو صراحت سے پیش کرتا ہوں۔

کلام میں مستی اور ڈھیلا پن | کلام اکبر میں بعض بعض جگہ محض الفاظ کی بہار اور معانی کی خزاں ہے کوئی بات نظم

میں ادا کرنے کے قابل ہو یا نہ ہو، موقع کہنے کا ہو یا نہ ہو مرحوم کو کہے جانے کی ایک عادت ہو گئی تھی۔ شعر کی اس عادت بدرجہا اعتراض کرتے تھے۔ حضرت کی شعر گوئی کچھ مستند نہیں ہے کہنے کی ایک حد پہنچنے کی حد نہیں ہے مگر خود اس جہل مرکب سے بچ نہ سکتے تھے اور زیادہ گوئی کو کہنے کی حد تک پہنچا دیتے

تھے مثلاً ۵

رحمین پکاری کہ نید جا بوا عجب جانور ہی یہ کا کا تو
زرا دیکھنا عقل ہی میری گم کدھر چونچ ہو اور کدھر اس کی

دیکھ کر مجھ کو وہ کہتے ہیں کہ اچھے تو رہے زندہ ہیں انس لیے جاتے ہیں اچھے کیا ہیں

اسکیم کا جھولنا دہ جھولیں لیکن یہ کیوں ایسی راہ بھولیں
دوسرے مصرع میں پورا ایک چوہ جرنی لفظ ”کیوں“ تقطیع سے گر جاتا ہے۔
ایمان بہر قائم جو رہا پیدا ہوئی آخر کس کی باہل ہی سکون اس میں جنہ ہو پھر دائرہ تحقیق کہا
پہلے مصرع کے حصہ اول کی تعقید لفظی بالائے طاق مطلب کی حد تک خدا جانے یہ
یہ شاعری ہے کہ نہ بیان ہی بوقت بخار

کالج واسکول کی بجتی ہے ہر سو تو مڑی چار دونی آٹھ ہیں اور فاکس معنی لوڑی
حقیقت میں کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ

بے کار مباحث کچھ کیا کر، کپڑے پھر ادھیر کر سیا کر
مرحوم کے کلام کا کچھ حصہ محض تراکیب کی عجوبگی، قافیہ پیمائی کی دھن اور
لفظی رعایتوں کے شوق کے باعث بگڑا ہے۔ مثلاً ۵
یہ چائے ہرگز نہیں ہو کافی نہیں ہو لینیڈ کا بندہ قائل

شراب ہی حلق سے نہ اتری تو شیخ صاحب نے پھر کیا
محض لینیڈ شراب اور چائے کی رعایت کی خاطر کافی لائے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسی آدرد
کے باعث پہلا مصرع روانی سے کافی محروم ہو گیا۔

شیخ صاحب جمعبندی میں نہ کیوں سمجھیں ہند کا اسلام بھی کھیوٹ میں اخل ہو گیا
دوسری جگہ کھیوٹ پرست کہہ کر فارسی ہندی کا پیوند لگایا ہے۔

محاذ اضافہ وہ بُت کھیوٹ پرست ہو کہتا ہو عاقبت کا یہی بند و بست ہو
زندگی سے میرا بھائی سیر ہو بھر بھی خوراک اُس کی ڈھائی سیر ہو
خوراک کی مشدد رے یا نہک "کاگر جانا اکبر کی بلا جانے اُن کو ڈھائی سیر کا
قافیہ بھائی سیر لانے کی دھن تھی وہ پوری ہو گئی۔

ہوئی جب آبد پیری ہوا میں سر کریشانی ترش دئی کی چٹنی جوڑی ڈاڑھی ہو کھجڑی
صنعت مراعات انظیر کی ضیافت طبع کے واسطے جو دسترخوان بچھایا گیا ہو اُس پر سر کر
ترش چٹنی اور کچھ دئی کے سوا اور کیا ہو۔

انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان ہونڈا الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خان میں
الم ترکیف کی رعایت سے فیل ضرور آگیا مگر حق مطلب ہرن ہو گیا۔
بھنڈا رے دُیدوں گا بے خوشی سیدھا جو گرد جی مانگیں گے

ہاں کام زرا ٹیڑھا ہو گا بسکٹ کو جو سوچی مانگیں گے
علائیہ ظاہر ہو رہا ہو کہ سیدھے ٹیڑھے کے شوق تضاد اور قافیہ کی خواہش نے شعر
لکھوایا ہو ورنہ گرد جی کو سوچی سے کیا تعلق۔

زور پر ہو شہر میں طاعون چارہ کیا کرو لاٹ صاحب تکس ہیں چپ پھر میں چارہ کیا کرو
اس میں کھلا ہوا قافیہ کا عیب ہو بچارہ اور چارہ میں حرف روی ہی غائب ہو۔
آخر مصرع کی بچارہ کی تب "کو حرف روی مانا جائے تو اول مصرع میں طاعون کے
"ن" کو حرف روی نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ یہاں نون ساکن ہو اور حرف روی کو
"ب" کی طرح متحرک ہونا چاہیے۔

جانستانی میں نہ چھوڑے گا دقیقہ باقی دل ستانی کے لیے لاف و فامارے گا
اس شعر میں جاں ستانی اور دل ستانی کے کھیل کے سوا کچھ نہیں ہو دوسرے لاف و فامارے
فارسی محاورہ ہو اُردو میں لاف مارنا نہیں آتا شیخی مارنا آتا ہو۔

خیالات و ترکیبِ غیر سے استفادہ | ایسا کلام کئی اجزا میں منقسم کیا جاسکتا ہے، ایک حصہ وہ ہے جس میں دوسرے

شعرا کے مشہور اشعار کو بطور تفسیق اپنے رنگ میں رنگا ہے اور مضمون میں بجز طفلانہ نقالی کے کوئی خاص ترقی پیدا نہ کر سکے جیسے حضرت حافظ کا شعر ہے
 الا یا ایہا الساقی اور کاسِ دنا دلہا کہ عشق آساں نمود اول دے لے فائدہ کل ہا
 اس کو جنگ کے زمانے میں جرحل صاحب وزیر سے مخاطبت کرتے ہوئے یوں بدل دیا ہے

الا یا ایہا البحر چل نظر کن سوئے ساحل ہا کہ جنگ آساں نمود اول دے لے فائدہ کل ہا
 نظر کن سوئے ساحل ہا کہہ کر کیا نئی بات پیدا کی ساحل کا ایک بیکار قافیہ پڑا سا
 مل گیا اُس کو باندھ دیا ایک آدھ لفظ کی ترمیم کر کے ہر طفل مکتب ہر جنگ کے قعر
 پر کہہ سکتا ہے کہ

الا یا ایہا الجاہل نظر کن سوئے ساحل ہا کہ جنگ آساں نمود اول دے لے فائدہ کل ہا
 پختہ عمری میں ایسی طفلانہ کوششیں کلام کی وقت کو اُس کی جائز رفعت سے نیچے
 گرا دیتی ہیں۔ بعض شاعرانہ خیالات مرحوم نے بالیقین دوسرے اساتذہ سے لیے
 ہیں اور بغیر کسی نمایاں تغیر کے اُن کو اپنی طرف سے ایسا پیش کر دیا ہے گویا یہ کسی اور
 کے مرہونِ منت نہیں ہیں نے اپنی مدت ملاقات میں بجز ایک اس شعر کے کہ
 کرتا ہوں ہر اینٹ پر نچے زکار ہتا ہے کام تنگ ہے وہ شمعِ مجد تاینخ داں فردوس
 جو کسی ایرانی کے اس شعر سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے

ہر کجا افادہ بینی خشت در ویرانہ ہست فردے دفترے احوال صاحبانہ
 اور اسلوب و مضمون ہر دو میں اچھا تغیر کر دیا ہے کسی موقع پر مرحوم کو اس کا اثر
 کرتے نہ سنا کہ ان ان اشعار میں وہ فلاں شعرا کے خیالات کے زیرِ بار احسان

ہیں میں نے کبھی کبھی دوسروں کا ملتا جلتا مضمون بتا بتا دیا تو یہ کہہ دیا کہ مجھے معلوم نہ تھا یا بالکل خاموش ہو گئے اور بات کو اڑا دیا مثلاً ایک منظوم خط مشہور ہے جو ایک مریض نے کمزوری . . . کی شکایت میں دہلی کے مشہور طبیب کو لکھ کر منظوم جواب حاصل کیا تھا اسی خط کا ایک شعر ہے

خروس وار سحر خیز زبودہ دھالا چو باگیاں ز سر برہیضہ برنی خیز
غالباً اکبر نے خروس و سحر خیزی کا مضمون دہال سے اڑایا اور اس کو اس شعر کی شکل میں ادا کر دیا ہے

سول سرحن تھارے آٹھ سے پہلے ہیٹھتے و لیکن ان کے مرغے کی سحر خیزی نہیں جاتی

بن گئی ہے خضر راہ دوستاں کید حریف ہے نماز گریہ زاہد سے خوش بکبک خفیف
حضرت حافظ شیرازی کی اسی آواز کی بازگشت ہو کہ مع
غزہ کن کہ گریہ زاہد نماز کرد

یا مرحوم کا یہ شعر ہے

ایثارِ حسرت و پنج دالم جاتا رہا غم ہوا اتنا کہ اب حاس غم جاتا رہا
مولوی امیر احمد صاحب امیر بدایونی کے اس مشہور شعر کا چربہ ہے کہ
ایثارِ الم و جور و ستم بھی نہ رہا کثرتِ غم سے اب اندازہ غم بھی نہ رہا
یہ شعر ہے

عشق میں حنِ بتاں وجہ تسلی نہ ہوا لفظ چمکا مگر آئینہ معنی نہ ہوا
غالب کے اس شعر کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے کہ
دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ہر وہ یہ لفظ جو شرمندہ معنی نہ ہوا
مرحوم کے کلام کے بعض حصص میں ترکیب اور بندشوں وغیرہ کے مد نظر غالب کا
صاف اتباع معلوم ہوتا ہے مثلاً

کون و مکان ظہور جمال حضور ہے غافل اسیر دام فریب شعور ہے
انگریزی الفاظ کی بھرمار | یہ انیسویں صدی کے انگریزی اقتدار سے مرعوبیت کا اثر تھا یا محض ہمہ دانی کا اظہار کہ اس زمانے

میں مشرقی السنہ کے ماہر ہمارے کئی بلند پایہ ادیب جن کے اسالیب بیان پر اردو ادب کو ناز ہے ایسے گزرے ہیں کہ فارسی عربی میں کامل دستگاہ رکھنے کے باوجود اپنی تقریر و تحریر میں انگریزی الفاظ و تراکیب کا کثیر استعمال ناگواری اور اعتراض کی حد تک کرتے تھے جن موقعوں پر اردو بندشوں سے بہرہ رسانی کام چل سکتا تھا وہاں بڑے بڑے اور غیر مانوس انگریزی الفاظ لائے تھے۔ ڈپٹی

نذیر احمد مولانا تھے، شمس العلماء تھے، حافظ قرآن تھے۔ اُن کی تقاریر کا مجموعہ دیکھیے تو سب درق پر کتاب کا نام لکچرس نظر آئے گا اور اس میں اردو زبان ایسی لے گی "فاؤنڈر آف اسلامیہ کالج کس کو کہا جائے۔ مسلمانان پنجاب ہی اس کے فاؤنڈر ہیں کالج بند ہو جائے گا تو وہ ہی ودھ اوٹ اپنی انجینئرنگ دنیا میں فضیلت ہوں گے۔ اسلامیہ کالج کا کریڈٹ انھیں کو مل رہا ہے۔ یہ کالج تو تمہارے سر پر

ہے اب تمہاری آنر (Honour) اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ اپنی آنر کو ونڈی کیٹ (Vindicate) کرو ونڈس کے جمع ہوئے پیچھے اُن کا ہینڈل (Handle) کرنا جمع کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔" نذیر احمد ڈپٹی کے یہاں نشر میں تو اکبر کے یہاں نظم میں قدم قدم پر اس میلان کا ثبوت ملتا ہے کہ اکبر کے نزدیک ہند کے پرزوں کے مقابلے میں "ولایت ہی کا مال اچھا ہے" کلام میں رفارمر (Reformer) آنر (Honour) بیف (Beef) ٹچ (Touch) پوائنٹ (Point) پارک (Park) بیلون (Balloon)

(Miss d'Souza) ایرشب (Airship) وغیرہ اس

کثرت سے غیر مانوس انگریزی الفاظ نظر آتے ہیں کہ طبیعت بار محسوس کرتی ہے اس پر ایجا د بندہ عجوبہ اضافیتں و تراکیب ذوق سلیم کا خون کرتی ہیں۔ دوٹ بازی ہسٹر نقلی، باگزٹ پئے مبرسی، گزٹڈ جنوں، ہنی کا بج، شوق ڈنر (Dinner) رفل بدست ہوٹ نوازی وغیرہ اکبر کی بریت میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ نقل کفر محض تفتن ہے لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ نفسیاتی حیثیت سے طبائع پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ سہکوں اور توتلوں کی نقل کرنے والوں کو دکھایا گیا ہے کہ بالآخر خود سہکے اور توتلے ہو گئے۔ جو بات نقل و مضحکہ کے طور پر کمبخت کی جاتی ہے وہ ایک عرصہ کے بعد نفس میں پیوست ہو کر جزو طبیعت بن جاتی ہے اکبر کے کلام میں انگریزی اضافی الفاظ اور تراکیب کی بہتات ملاحظہ ہو۔

(۱) قائم ہی بوٹ اور موزہ رکھے دل کو مشتاق مس ڈسوزا رکھے

(۲) پوائنٹ یہ سخت ہے اسے سچ نہ کرو۔

(۳) تم شوق سے کلج میں پھلو پارک میں پھلو۔

(۴) ایرشپ سے ہم پناہ ای جیفے پائیں گے کہاں۔

(۵) منہ بند ہو سکے گا کہاں شریف کا چکا مگر نہ جائے گا صاحب کے بیف کا

(۶) بیلون (Baloon) میں وہ کریں خدا سے باتیں۔

(۷) دوٹ بازی پر مگر یہ بند جاوی ہو چکی۔

(۸) لیڈروں کی مھوم ہے اور قانون کو نہیں سب نے جنرل ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

(۹) مسٹر نقلی کو عقی میں سزا کیسی ملی۔

(۱۰) بے گزٹ ہکے جو پیسے تو محل میں تھیر باگزٹ ہکے جو چلیے تو فرشتوں میں خفیف

(۱۱) پئے مبرسی جو اچھے سمجھ اس کو خون چھا یہ بجا ہے قول شاعر گزٹڈ جنوں اچھا

(۱۲) پانوں میں تو مہندی ہے لگی شوق ڈنر کی۔

- (۱۳) مشکل تو یہ ہے لیکن کہ ادھر آخر بھی ہو اور خواہ بھی ہو۔
 (۱۴) شوق لیلائے سول سرسختی بچھن کو اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پستون کو
 (۱۵) سگے بدن بال و نشہ مری رفل بدست و غرور در سر۔
 (۱۶) جب لیا لیمس وہ رعب رفل جاتا رہا۔
 (۱۷) گردن رنہار مر کی ہو ایک سمت تن گئی۔
 (۱۸) مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

مخرب اخلاق مضامین | قوم کی خوش بختی یا بد قسمتی سے حال میں اردو ادب کا خادم ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو ہر گندگی اور بے حیائی کو اس فلسفیانہ نظریہ کے تحت کہ غیرت اور بے غیرتی اضافی امور ہیں اور غلط تخیلات پر مبنی آرٹ قرار دے کر بے بائگ دہل بیان کرتا ہے میرے محب مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم (معتمد کثیر امتحانات سرکار آصفیہ) اس خیال کے بڑے موید تھے اور بحث کرتے رہتے تھے کہ خاص خاص نام نہاد گندے الفاظ و خیالات جن کو مہذب دنیا ناشی شرم کے تحت زبان پر نہیں لانی ادب میں علائق استعمال ہونے چاہئیں، غالباً ایسے لوگوں کو ادب میں بے ادبی کی سند جاننا چرکین اور اکبر جیسے بزرگوں سے ہاتھ آئی ہے۔ اس وقت میں اکبر کے رلیک اور غلیظ اشعار کی صراحت کر کے مہذب لوگوں کی آنکھیں جھکانا یا معائب کو فیشن بنانا نہیں چاہتا اس خصوص میں اپنا خیال اور اکبر مرحوم سے اختلاف کا حال تن کتاب میں واضح کر آیا ہوں۔ یہاں محض چند مزید اشعار نمونے کے طور پر پیش کر دیتا ہوں
 میں ہوا ان سے نصحت ای اکبر وصل کے بعد تھنک یو کہہ کر

اقضا فطرت کا کرتا ہے کہیں ای ہمنشیں شیخ صاحب کو بھی آخر کار شب کرنا پڑا

سینہ صُبت کا اُبھار اُمی دل فدا انگیز ہو ، لوگ سچ کہتے ہیں بادِ تِجان بادِ انگیز ہو

سینہ پُرتوں کے دسترسِ نکل ہو پوانٹ یہ سخت ہو اسے ٹچ نہ کرو

پٹ بھی جا رہے اکبرِ غضب کی سیوٹی ہو نہیں نہیں بہ نہ جا یہ جاکِ ڈیوٹی ہو

کر بیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار یہ بت تو زورِ زر ہی چت ہوتے ہیں

شمر بدایونی کو بھی اپنی واسوخت میں ہی موقع پیش آیا ہو دیکھیے زنانِ بازاری
کی فطرت کو کس ہند پیرایہ میں ادا کر گئے ہیں ۛ

الفت و مہر کے اظہار تو کم ہوتے ہیں نقشِ حُبان کے لیے نقشِ درم ہوتے ہیں

بدگماں ہرگز نہ ہوں ہم جو اُن کو چپت کریں ہو فقط یہ مدعا اُن کی کرنا بت کریں
خدا جانے اس کُشم کُشا سے کرنا بت ہوتی ہو یا اور ٹوٹتی ہو۔

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی پر دل نہ جھکا آج تک شوقِ سقنقر چلا جاتا ہو

اگر بات صرف شیخ صاحب کے ”کارشب“ کا مذاق اڑانے کی حد تک ہوتی تو کچھ
گوارا کی جاسکتی تھی لیکن بڑی دیکھیے کہ شیخ صاحب کی زوجہ محترمہ کا شوق کس جوش کے ساتھ
پیش کیا گیا ہو

بی شیشانی بھی میں بڑی ذی ہوش کہتی ہیں شیخ سے بجوش و خروش

خواہ لنگی ہو خواہ ہو تہہ بند درِ عملِ کوش و ہرچہ خواہی پوش

کاش ایسا مخربِ اخلاق حصّہ اکبر جیسے مصلح کے کلام میں نہ ہوتا مگر ایک انگریزی مثل ہو

There is no use crying over spilt milk

گرے دودھ پر آنسو بہانے سے نتیجہ کیا ۛ

دل سے کہتا ہوں کہ ہاں شمع بصیرت نہ بجھے
وقت سے کہہ نہیں سکتا کہ شبِ تار نہ بن

تاریخ تصنیف کتاب ہذا

از

مولوی مجتہد الدین صاحب عیش بدایونی

مطلوب ملک کو تھی جو سیرت منور لکھ دی قمر نے کسی بے مثل اور بہتر
تاریخ بھی چمکتی اور عیش ہاتھ آئی روشن کیا قمر نے نامِ جابِ اکبر
۱۳۵۵ھ

تاریخ تکمیل کتاب ہذا

از

مولوی تمنا حسین صاحب تمنا بدایونی

اُردو کو چار چاند قمر نے لگا دیے کہتا ہوں دل کمالِ سخنور کہو اسے
کیا خوب حالِ حضرتِ اکبر کیا رقم آئینہ حیات کا جو ہر کہو اسے
تاریخ کے لیے ہو تمنا یہ فسر کیوں
لکھی قمر نے سیرتِ اکبر کہو اسے
۱۳۵۵ھ

انتخاب وحید

اکبر الہ آبادی کے استاد حضرت وحید
کے کلام کا انتخاب۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔
قیمت مجلد پہلے، بلا جلد علم
انجمن ترقی اُردو و ہند، دہلی

۸۹۱۵۴۳۱۹ ق - ب

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

ق - ب

۸۹۱۵

محمد امین احمد بدایونی
بزم اکبر

کتابخانه

جامعہ

۱۔

۲۔

۳۔

۴۔

۵۔

۶۔

۷۔

۸۔

۹۔

۱۰۔

۱۱۔

۱۲۔

۱۳۔

۱۔

۲۔

۳۔

۴۔

۵۔

۶۔

۷۔

۸۔

۹۔

۱۰۔

۱۱۔

۱۲۔

۱۳۔

۱۴۔

۱۵۔

۱۶۔

۱۷۔

۱۸۔

۱۹۔

۲۰۔

۲۱۔

۲۲۔

۲۳۔

۲۴۔

۲۵۔

۲۶۔

۲۷۔

۲۸۔

۲۹۔

۳۰۔

